

۱
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تبصرہ

رقمزدہ جناب سید محفوظ علی صاحب بی اے (علیگ)

جس ملک یا حصہ ملک میں جو زبان بولی جاتی
ہے وہ وہاں کے مردوں اور عورتوں دونوں کی مشترکہ
زبان ہوتی ہے۔ لاریب۔ مگر اس میں بھی شک نہیں
کہ اسی مشترکہ زبان میں طرز ادا کے اعتبار سے دونوں جنسوں
کی خصوصیات بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہیں۔ بعض زبانوں میں
ضائے کے سوا مردوں اور عورتوں کے اظہار خیال کے عام
حیدر آبادک ڈیو، حیدر آبادک۔

پیرائے میں کوئی بین تغیر نظر نہیں آتا اگر ان میں بھی دونوں
جنسوں نے خاص خاص الفاظ۔ خاص خاص محاورے
اور خاص خاص ترکیبیں اپنے اپنے لیے مخصوص کر لی ہیں۔
جب ان زبانوں تک میں جن میں تذکیر و تانیث کا
چندان لحاظ نہیں جنسی خصوصیات موجود و مقرر ہیں تو
ہماری اُردو کے معنی کا کیا کہنا اور کیا پوچھنا جس میں
خیر سے اسما و میں جنسی فرق۔ صفات میں جنسی فرق۔
افعال میں جنسی فرق۔ متعلقات افعال میں جنسی فرق۔
اور محاورات میں جنسی فرق ہے۔ اور ان فرقوں کے
متعلق ذرا سی بے توجہی کرنے سے۔ ”خود غلط انشا غلط املا
غلط“ ہو جاتا ہے۔

ایک سادہ سا نصف و چین لفظوں کا فقرہ ہے
”اصغر اچھا خاصا سیانا ہو گیا ہوگا“ لیکن جب یہی فقرہ

اصغر کی سگی بہن اصغر کی لیے بولا جائے تو یوں بدل جائے گا۔ ”اصغر اچھی خاصی سیانی ہو گئی ہوگی۔“ اب چاہے بھائی بہن شکل صورت میں عین میں ایک ہی سے ہوں لیکن ان کے لیے جو دو چھوٹے چھوٹے فقرے بولے گئے ہیں ان کے ہر لفظ میں فرق ہے۔

اردو میں جنسی خصوصیات کی افراط اس کی مقتضی تھی کہ جس طرح مردوں اور عورتوں کی بول چال میں فرق ہے اسی طرح ان کی لکھ پڑھ میں بھی فرق ہو۔ سردار ارسلان خان پول زئی، اگرچہ ولایتی پٹھان اور کابل سڑا بہن مگر عرصے سے دہلی میں رہنے سننے سے ایسی ہی صاف اور صحیح اردو بے تکلف بولتے ہیں جیسی دہلی کا کوئی پشتینی پڑانا نہیں۔ وہ عموماً تذکیر و تانیث کی غلطی نہیں کرتے اور بخلاف دوسرے غیر ملکیتوں کے ”گھوڑی نہ کھا چکی“

اور ”گھوڑا دانہ کھا چکا“ کو اپنے اپنے صحیح موقعوں پر بولتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنی بی بی یا لڑکی یا کسی اور مؤنث زمی رُوح یا غیر ذی رُوح کا قول نقل کرتے ہیں تو ہمیشہ اُردو کے اہم ترین قاعدے کی گردن مروڑ ڈالتے ہیں:-

”خانم کہتی ہیں خاتون اسٹور سے برقع منگا دیجیے

آج خدام کعبہ کے جلسے میں جاؤں گا۔“

”گھوڑی کہتی ہے ریل سے پہلے پہنچا دوں گا

آپ گھبراتے کیوں ہیں“

”ہوا کہتی ہے میں آج نہیں تھمؤں گا۔“

ایسے موقعوں پر جس منطق سے وہ اپنے آپ کو حق بجانب

ثابت کرتے ہیں اُس کا ملخص یہ ہے:-

”ہم مرد اور بچان ہیں اس لیے ہم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا

کہ اپنے مردانہ افعال و انشخص کا تعقل کرتے ہوئے

ضمیمہ کلم کو چاہے باز رہو یا مستتر کسی صیفہ تانیث کے ساتھ استعمال کریں۔ مانا کہ وہ ضمیمہ کلم کسی عورت کے قول کی نقل ہے۔ ہو کرے۔ ضمیمہ کلم تو ہے۔ اور ضمیمہ کلم اپنے لیے بولتے ہیں۔ اور ہم بہ فضل خدا مردہین لہذا ہم صیفہ تانیث کیون بولنے لگے تھے۔

سردار صاحب ٹھوس اور سیاٹ پٹھان ہیں اس لیے جو دل میں تھا اُس پر عمل بھی کیا اور وقت پر صاف کہہ بھی دیا لیکن سچ پوچھو تو دل میں ہم سب مردوں کو لفظ میں کے ساتھ آون گی۔ جاؤن گی۔ بولنا ایسا ہی گران بکبار کا معلوم ہوتا ہے جیسے گکڑوں کون بولنا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دل کا حال ظاہر نہ کریں۔

جب مردوں کے دل کی یہ کیفیت ہے تو کیا اُن لڑکیوں کے دل میں بھی ایسا ہی خیال نہ آتا ہو گا جو لڑکوں کے

پڑھنے کی کتابیں یاد کرتی ہوں گی؟ اصل میں یہی خیال اس
 امر کا داعی و محرک ہوا کہ لڑکیوں کے پڑھنے کی کتابیں علاحدہ
 تیار کی جائیں اور یہی خیال اُردو کے سرمائے میں وزبہ رو
 اُس خزانے کا اضافہ کر رہا ہے جسے زمانہ لٹریچر کہتے ہیں۔
 اس کی فراہمی میں سب سے زیادہ حصہ پہلے مردوں ہی نے
 لیا ہے۔ شکر ہے کہ اب عورتیں بھی شریک ہوتی جاتی ہیں
 مرد ہو کر عورتوں کی بولی بولنے والے پہلے سعادت یار بننا
 اور اُن کے بعد میر یا علی تھے۔ مگر افسوس کہ دونوں نے یہ
 روپ اس بُری طرح بھرا کہ اس سلسلے میں اُن کا نام لینے
 کو حق نہیں چاہتا۔ زمانہ لٹریچر کی شان دار عمارت کا سنگ بنیاد
 اُسی وقت رکھا گیا تھا جب رنگین کے دماغ نے ریختی ایجاد
 کی۔ مگر اُن کی تصانیف اور اُن سے زیادہ دوسرے صاحب
 کی تصانیف (جن کے تخلص کھنک کی قلم تک کوشش نہیں پڑتی)

اُردو کے دامن پر گندی چھینٹیں ہو گئیں۔ اور اُن کا دیکھنا عورتوں کو کیا مردوں تک کو جائز نہیں۔

اب عورتوں کی زبان میں اور عورتوں کے پڑھنے کے لیے سب سے پہلے اور میری رائے میں اس وقت تک سب سے بہتر جو کتابیں لکھی گئیں وہ مولانا نذیر احمد مرحوم کی ہیں۔ مرحوم نے یہ کتابیں لکھ کر عورتوں پر جو احسان کیا ہے اُس کی شکر گزاری کی اگر کوئی صورت ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ ہر لڑکی جب وہ عبارت پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائے چاہیے کہ ایک دفعہ اُن کی ہر کتاب (جو عورتوں کے لیے لکھی گئی ہے) اول سے آخر تک پڑھ جائے۔

مولانا نذیر احمد مرحوم کے بعد بلکہ اُن کے زمانہ حیات ہی سے اُن کے عزیز اور اُردو کے مشہور افسانہ پرداز

عبدالرشید انخیری صاحب ان کے نقش قدم پر چل کر زمانہ
 لٹریچر کی بہت کچھ خدمت کر رہے ہیں۔ وہ کسی کتاب میں ملک
 میں شائع کر چکے ہیں اور ایک چھوڑ دیا ہوا رسالوں
 کی ایڈیٹری بھی کرتے ہیں۔ صاحب موصوف جو کچھ لکھتے
 ہیں ٹھیسٹ عورتوں کی زبان میں لکھتے ہیں۔ محاورے
 خاص دلی کے مستند۔ زبان نکسالی جس میں مٹھاس بھی
 اور نمک مرچ بھی۔ لیکن قصور معاف ہو تو میں یہ عرض
 کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ بسا اوقات مٹھاس کی اس قدر
 کثرت یا نمک مرچ کی اس قدر شدت ہوتی ہے کہ زبان
 پینا ہانگنے لگتی ہے۔

مسلمانوں میں بہت سے فرد و مردوں کی بد مذہبی
 اور بے علمی کی وجہ سے بہت سی عورتوں پر ظلم۔ جس سے
 بے رحمی اور نا انصافی ہوئی اور ہوتی ہے جس کا نتیجہ اُن

بیچاری عورتوں کے حق میں مفلسی۔ کس میسری۔ تباہ حالی۔
 پریشانی اور افسردگی ہو اور ہوتا ہے اور اسی سے اُن
 بد نصیبوں میں رنج۔ غصہ۔ خواہش انتقام۔ بے صبری۔
 ناشکری۔ بد زبانی اور بد مزاجی آگئی اور آجاتی ہے۔
 صاحب موصوف چونکہ سوسائٹی کے اس تاریک رُخ
 کے خاکے کثرت سے کھینچتے رہے ہیں اس لیے مجھے
 خوف ہے کہ اُن کے قلم کی زبان میں یہ اثر سرایت کر گیا۔
 اور اس لیے اُن کی تصویروں میں بھی خوش خلقی۔ شگفتگی
 نیک مزاجی۔ خندہ روئی۔ محبت پاس ادب اور حفظ ادب
 کے مراتب کے خط و خال مشکل سے نظر آتے ہیں۔
 مجھے تسلیم ہے کہ سوسائٹی کا یہ رُخ نہایت تاریک
 نہایت بھیاناک۔ نہایت نفرت انگیز اور نہایت شرم آؤ
 ہے۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ اس رُخ کی تصویریں کھینچنی بھی

نہایت ضروری ہیں! مگر میری رائے ہے کہ یہ تصویریں
 صرف مردوں کو دکھائی جائیں اور جس طرح ولایت میں بعض
 کتابوں اور البموں پر لکھا ہوتا ہے کہ ”صرف مردوں کے لیے“
 اسی طرح ان پر بھی یہی لکھا ہو۔ بلکہ اس قدر عبارت اور ہو ”پڑھو
 سوچو اور شراؤ کہ تم نے اپنے ظلم جبر۔ بے رحمی اور بے انصافی
 سے اپنی رفیقِ زندگی کی حالت کیا سے کیا کر دی ہے“ عورتوں
 کو ان تصویروں کے دکھانے میں میری رائے میں یہ خرابی
 ہے کہ اپنی ہم جنسوں میں رنج۔ غصہ۔ خواہش انتقام۔ بے صبری
 ناشکری۔ بدزبانی اور بد مزاجی دیکھتے دیکھتے یہ خود بھی ان
 عادتوں کو اختیار کرنے لگیں گی دوسرے ڈرے کہ کہیں
 بلا وجہ ذاتی عام جنسِ ذکور سے نفرت۔ عداوت اور
 بے تعلقی نہ پیدا ہو جائے جس سے نظام خانہ اور طمانیت
 خاطر ہی رخصت ہو۔

راشد الخیری صاحب نے لڑکیوں کے لیے جوانی
 لکھی ہے عرصہ ہوا اُسے میں نے بھی دیکھا تھا۔ اگرچہ اُس
 بعض خطوط اعلیٰ درجے کے ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جن
 بنا پر مجھے افسوس کہ اُس سے مایوسی ہوئی۔ انھیں دنوں
 ایک خاتون نے الناظرین اسی انشا کے متعلق اپنے خیال
 کا اظہار کیا تھا۔ میں یہاں اُن کے طرز تحریر کی داد دینی نہیں
 چاہتا مگر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ دیکھ کر ایک نہایت
 خوش گوار تعجب ہوا تھا کہ ہماری بہنوں اور بیٹیوں میں ماشاء
 تمیز و تنقید کا مذاق پورے طور پر موجود ہے اور وہ خواہ
 محسوس کرتی ہیں کہ ایسی کوئی کتاب جس سے تعذیبِ رفا
 کا خیف سا بھی احتمال ہو لڑکیوں کے ہاتھ میں قضا
 نہ جانے پائے۔

اب مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ انھیں خاتون

نے لڑکیوں کے لیے خود ایک انشا ترتیب دی ہے جس میں
 کے چار خط اُنھوں نے اننا طریقین اشاعت کے لیے دیے
 ہیں۔ اگرچہ مٹھی بھر فونے سے خرمن یا خردار کی نسبت لے قائم کرنی
 محض خوش عقیدگی ہے لیکن (ہمت افزائی کی غرض سے
 نہیں کہتا اس لیے کہ اس کی اُنھیں حاجت نہیں۔ خوشامد
 کی راہ سے نہیں کہتا اس لیے کہ اس کی مجھے عادت نہیں)
 جہاں تک میں ان چار خطوں سے اندازہ کر سکا، میرے
 ناقص خیال میں یہ انشا۔ انشاء اللہ لڑکیوں کے لیے بہت
 مفید ہوگی اور زمانہ لٹریچر کی ایک شدید ضرورت کو پورا
 کرے گی بشرطہ کہ اور خطوط بھی ایسے ہی بلکہ اس سے
 اچھے ہوں۔

زبان کے متعلق تو میں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ شاید
 بیگم صفدر علی خود لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔ سب سے بڑی بات

یہ ہے کہ ان خطوں کے الفاظ لکھنے والی اور خیالات سوچنے والی سچ سچ ایک عورت ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ مولانا ندیر احمد ہون یا مسٹر راشد الخیری عورتوں کی زبان سے جو کچھ وہ ادا کریں گے محض آورد۔ تصنع اور غیر واقعیت ہوگی چاہے وہ کتنی ہی قابل تعریف کیوں نہ ہو۔ لڑکیوں کی انشا اگر کسی مرد کی تصنیف ہو تو جو خط نصیرہ کی طرف سے زاہدہ کے نام ہو گا وہ چاہے کتنی ہی قابلیت اور واقفیت (یعنی حقیقت میں کتنی ہی نقالی اور فریب نہی) سے لکھا گیا ہو پھر بھی وہ اُس قلم کی جنبش کا نتیجہ ہو گا جو نصیرہ کی نہیں

۱۔ متعلق صفحہ ۱۲ لکھنؤ کی تو نہیں مگر نواح لکھنؤ کی ضرور رہنے والی ہیں۔ منشی امیر احمد

مینائی مرحوم و مقفور منشی ممتاز علی آہ۔ منشی احمد علی شوق قدوائی اور منشی واحد علی ابرقدوائی کے

سے استادان فن اور شعراء اکمال سے فیض یاب ہونے کا جسے موقع ملے اُس کی زبان کا کیا

کہنا اور یہ چاروں حضرات موصوفہ کے بزرگ و عزیز خاص ہیں۔ ایڈیٹر الناظر۔

بلکہ نصیر خان کی انگلیوں میں دباتھا۔ اور اس لیے اُس خط کا اندازِ تحریر چاہے کتنا ہی زنا نہ ہو لیکن اندازِ تخیل ضرور مردانہ ہوگا۔ ہم عورتوں کی زبان مستعار لیکر زانیہ بات چیت ضرور کر سکتے ہیں مگر ہم عورتوں کا دماغ مستعار لیکر زنا نہ خیالات ہرگز نہیں سوچ سکتے۔ سوسائٹی کی عام خوبیوں اور عام بُرائیوں پر ہماری نظر کتنی ہی وسیع اور عمیق ہو لیکن جو صنفی خوبیاں اور جنسی بُرائیاں عورتوں میں۔ اُن کے دل میں ان کے دماغ میں مضمحل ہیں اُن کا صحیح اندازہ اور ٹھیک پتہ ایک عورت ہی لگا سکتی ہے اور وہی دوسری عورت کو اپنے ناقابلِ ادراک اور ناقابلِ تقلید طریقے سے سمجھا سکتی ہے۔

بیگم صفدر علی نے مسٹر راشد الخیری کی انشا کو اُس کے راقعاتِ خطوط کے طعن و تشنیع زبانِ درازی و فقرہ بازی۔ عامیانہ

محاوروں اور سؤقیانہ روزمرہ کی بنا پر ناپسند کر کے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ لڑکیوں کے لیے جو کتاب لکھی جائے اُس میں ”مہذب الفاظ اور سنجیدہ عبارت کا لحاظ رکھنا لازمی ہے تاکہ لڑکیوں کی زبان پر یہودہ الفاظ نہ آنے پائیں اور خیالات میں کمی نہ پیدا ہو جائے“ میں نے اسی تنقید کی خرد وہین عینک سے چاروں خطوں کو پڑھا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان میں کوئی لفظ یا خیال ایسا نہیں جس سے خود اُن کی تکذیب و تبکیت ہو سکے۔

مجھے امید ہے کہ سلیم صفدر علی اسی روشن پر اور اسی رنگ میں ساری کتاب ترتیب دیکر شائع کر دیں گی جس سے لڑکیاں اور نیز لڑکیوں کے والدین اُن کے شکر گزار ہوں گے۔

غلطیوں کی فہرست

صفحہ	خط	سطر	غلطی	صحیح
۵	۱۲	۲	کچھ نہین	کچھ نہین
۶۳	۱۳	۸	یجھی برکی	یجھی برکی
۶۴	۱۴	۶	بڑے سے بڑے	بڑے سے بڑے
۶۵	۱۴	۱۳	جن	جن کو
۶۸	۱۵	۴	انقلابات	انقلابات
۶۹	"	۱	خط دیکھنے کو	خط دیکھنے کو
۸۱	۱۷	۶	جھولے پڑتے ہیں	جھولے پڑتے ہیں
۸۴	۱۷	۶	عمہ جنیان	عمہ جنیا
۸۷	۱۸	۸	پھپی جان	پھپی جان
۸۸	"	۶	"	"
"	"	"	یہن	یہن
۹۴	۲۷	۲	پھپی	پھپی
"	"	۸	"	"
۹۶	۲۱	۸	"	"
"	"	۱۰	"	"
۱۰۲	"	۱۲	سیروج	سیروج
۱۰۴	"	۲	پھپی	پھپی
۱۱۰	"	۷	"	"
۱۱۲	"	۳	سیٹ	سیٹ
۱۱۴	"	۹ و ۸	شریک ہو ہونے	شریک ہونے

تہذیب

ان خطوط کے ناظرین سے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس چھوٹی سی انشا کے شائع کرنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ میں بھی زمرہ مصنفین میں گنی جاؤں۔ میں جانتی ہوں اور تسلیم کرتی ہوں کہ میرے دماغ اور قلم میں وہ قوتیں نہیں ہیں جن کی ضرورت ایک مصنف کے لیے ہوا کرتی ہے۔ یہ چند اوراق جو انشا کی صورت اختیار کیے ہوئے عام نگاہوں کے سامنے پیش ہو رہے ہیں (اور جن کے چھوٹے سے

مجموعے کو انشا کا لقب دیتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ کبھی انشا کا نام پائیں گے۔ ان کی شان نزول صرف یہ ہے کہ میری لڑکی اور دو بھانجیاں جب اس قابل ہوئیں کہ اُن کو طرز تحریر کی تعلیم دی جائے۔ تب میں نے املا کی صحت۔ انشا کی روانی اور عبارت کی سلاست سے اُن کی تحریروں کو ٹھیک کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کبھی خود خط لکھ کر اُن کو دیدیتی تاکہ وہ نقلین کریں۔ اور کبھی میں عبارت بولتی جاتی اور وہ لکھتی جاتیں۔ رفتہ رفتہ یہ خطوط جمع ہو گئے۔ اور لڑکیوں نے خواہش ظاہر کی کہ چھپوائے جائیں۔ ابھی میں اس پس و پیش میں تھی کہ چھپوانا یا نہیں۔ کہ اتفاق سے میرے عزیز بھائی رسالہ الناظر کے ایڈیٹر آگئے۔ انھوں نے ان خطوں کو دیکھ لیا۔ اور مصر ہوئے کہ ضرور شائع کر دیے جائیں۔ بلکہ چند خط لے بھی گئے۔ اور الناظر

اُن کو کمال بھی دیا۔ اب تو بعض بہنوں اور بھائیوں کی تحریریں میرے پاس آنے لگیں کہ ایک ایسی انشا کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ جو عورت ہی کے قلم سے عورتوں ہی کی سیدھی سادی زبان میں لکھی گئی ہو۔ ایسا منشا پا کر باقی ماندہ خطوں میں سے چند اور بھی میں نے الناظر اور ظل السلطان میں شائع کرادیے۔

میں اُن بہنوں اور بھائیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جنہوں نے الناظر اور ظل السلطان میں خطوں کو دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اور یوں میری ہمت افزائی کی۔ میں لکھ چکی ہوں کہ یہ چند خط انشا کھلانے کی حیثیت نہیں رکھتے اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے۔ (بشرطیکہ زمانہ فرصت دے) کہ اس ٹکڑے کو پہلا حصہ قرار دوں۔ اور دوسرے حصے کے لیے کچھ اور خطوط لکھوں۔ خدا کرے لڑکیاں شوق سے پڑھیں اور

فائدہ اٹھائیں۔ یہی تمنا ہے جس نے مجھے سر مغزن پر پھر آماؤ
 کیا ہے۔ چونکہ ان خطوں کا سرمایہ میری لڑکی بلقیس جہان
 اور میری دو بھانجیوں (دختران خان بہادر مولوی محمد
 نہال الدین احمد صاحب نیشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر) کے ہاتھوں فرام
 ہوا ہے۔ لہذا میں اس انشا کو انھیں کے ناموں سے معنون
 کرتی ہوں۔

بیگم صفدر علی

۳۔ نومبر ۱۹۱۵ء

۱ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خط (۱)

چھوٹی ٹہن کے نام

جملہ ۱-۵ جون ۱۹۵۷ء

پیاری سلیمہ - خوش رہو

تمہارا خط پہونچا۔ خیریت پا کے خوشی ہوئی۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ امان جان کو مطمئن کر دو۔ فہیم کو البتہ پرسوں سے حرارت ہے۔ یہاں آج کل چیچک کا بڑا زور ہے اور میں اس موذی مرض سے بہت ہی ڈرتی ہوں۔ ٹیکا تو سب بچوں کے ابھی میں بائیس ہی دن ہوئے دلا چکی ہوں۔ سچے موتی بھی تین تین دن سب کو کھلا دیے ہیں۔ بائیں ہاتھ کی چھنگلیا والی گھائی میں جو نکین بھی لگا دی گئی ہیں۔ مطلب یہ کہ احتیاط اور تدبیر تو حتی الامکان کر چکی ہوں۔ آگے جو اللہ کی مرضی۔ فہیم کو حرارت

کسی وقت ہو جاتی ہے۔ اور کسی وقت بالکل نہیں ہوتی۔ اس سے چیچک کا اندیشہ نہیں ہے۔ کل تک اور دیکھ لون۔ پرسوں بھی اگر خدا نہ کرے حرارت ہوئی تو عمل دون کی۔ اکثر معده صاف نہونے سے بچون کو اس قسم کی شکایتیں ہو جاتی ہیں۔

تم نے کٹھ پتلی کے تماشے کا حال لکھتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ”اماں جان تو بچاے ہنسنے اور خوش ہونے کے رونے لگیں تماشے میں ہم سب سے زیادہ دلچسپی بھی اُنھیں کو ہوئی۔ ہم لوگ تو کبھی کبھی اُٹھ بھی گئے مگر وہ اُس وقت تک نہ اُٹھیں۔ جبک کھیل ختم نہ ہو لیا۔ میں حیران ہوں کہ اماں جان کو بچون کے کھیل میں ایسی کیا بات نظر آئی جس سے اُن کو اتنی دلچسپی ہوئی۔ اور پھر روتی بھی جاتی تھیں“ سلیمہ کٹھ پتلی کا تماشہ بچون کا کھیل ہی نہیں۔ عبرت کا قصہ ہے۔ نصیحت کی داستان ہے۔ صوفیوں کو اکثر اس میں لطف آتا ہے وجہ یہ کہ کٹھ پتلی کا تماشہ ہو بود دنیا کا نقشہ ہے۔

اگر غور سے دیکھو اور سمجھو تو یہ تماشا ہم کو بتاتا ہے کہ دنیا فانی ہے
 دل لگانے کی جگہ نہیں۔ دنیا کی مثال بالکل اس تماشے کے
 چھوٹے اسٹیج اور اُس کے ننھے مئے ایکٹروں کی سی ہے۔ ایک
 دن ایسا آنے والا ہے جب یہ دنیا اور اس میں چل پھل پیدا
 کرنے والے انسان یوں ہی مٹ جائیں گے۔ جیسے یہ اسٹیج اور
 ایکٹرس ہماری سانس کا تار بھی ہمارے بنانے والے کے ہاتھ میں تھکا
 ہے۔ جیسے اُن گڑیوں کا تار اُن کے پچانے والے کے ہاتھ میں
 اور جس طرح محض اس تار کے کٹ جانے پر یہ چلتی پھرتی صورتیں
 گر کر اسٹیج کو حسرت کا گھر بنا دیتی ہیں۔ اسی طرح ایک دن ہم بھو
 نفس کا تار ٹوٹ جانے پر یوں ہی بے جان ہو ہو کر دنیا کے اسٹیج
 پر گر جائیں گے۔ پھر جیسے یہ تماشا گاہ بغیر ان تیلیوں کے اگھا بھینکا
 جاتی ہے۔ ویسے تماشا گاہ عالم بھی ہمارے بعد فنا ہو جائے گی۔
 اگر ان باتوں پر نظر کر کے کٹھن تلی کا تماشا دیکھا جائے تو

فی الحقیقت دلچسپی کے ساتھ عبرت کو بھی لے ہوئے ہے۔ مگر جو لوگ محض تماشایا بچوں کا کھیل سمجھ کر دیکھتے ہیں۔ اُن کی نظر کسی نتیجے تک نہیں پہنچتی۔ اس لیے اُن کو دلچسپی تو ہوتی ہے مگر عبرت نہیں ہوتی۔ ہم لوگ عموماً کسی چیز کو غور کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ خدا کو اور اپنے فانی ہونے کو بھولے ہوئے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز۔ ذرے سے آفتاب تک فنا ہونے کا سبق اور خداے واحد کے موجود ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ اس پر بھی ہم نہ سمجھیں اور نہ دیکھیں تو ہماری سمجھ اور آنکھوں کا سراسر قصور ہے پیاری سلیمہ۔ خدا کی قدرت کے کرشمے ہر چیز میں نظر آتے ہیں۔ وہ کون سی شے ہے جس میں اُس کا ظہور نہیں۔

برگ درختانِ بسز در نظر ہو شیار ہر درختے دفتر لیت معرفتِ کرو کا
 ذرا اس جگہ گاتے ہوئے سورج کو دیکھو۔ اس چمکتے ہوئے چاند پر نظر کرو۔ ان جھللاتے ہوئے چھوٹے بڑے ستاروں پر نگاہ جاؤ۔

اور دل کے کانون سے سُنو کہ یہ سب زبان بن کے کیا کہتے
ہیں۔ کہ رہے ہیں کہ اے دیکھنے والے ہم پر سرسری نگاہ ڈال کر
ہماری تحقیر نہ کر۔ ہمیں روح کی آنکھوں سے دیکھ۔ ہم میں وہ چیز
ہے جو کتابوں کے صفحات میں نہیں۔ ہماری آب و تاب میں
خدا کی قدرت اور صنعت کا جلوہ دیکھ اور ہمارے فنا ہو جانے
سے ہر چیز کے فانی ہونے کا سبق لے۔ ہم کو دیکھ اور اُس
لازوال وجود پر ایمان اور یقین لاجس کے زبردست ہاتھ ہم کو
اور ہماری سی بیشمار خوشنما اور بہ کار آمد چیزوں کو بنانے اور
بگاڑنے پر قادر ہیں۔ اے غافل اور فانی ہستی یعنی انسان
نادان نہ بن۔ بصیرت کی آنکھیں کھول۔ ذرّہ ذرّہ۔ قطرہ قطرہ۔
صبح اور شام۔ پھول اور پھل۔ غرض ہر شے تجھ کو فنا کی تعلیم
دے رہی ہے۔ چند روزہ زندگی پر نہ بھول۔ یاد رکھ کہ تجھے بھی
ایک دن فنا ہے۔ اور خوب سمجھ لے کہ۔

سب کے لیے راہ ہے فنا کی باقی اک ذات ہے خدا کی

(شوقِ مَدِوائی)

سیلیمہ۔ اگر تم نے غور سے کام لیا ہوتا تو تم کو اس بات
پر تعجب نہ ہوتا۔ کہ امان جان تماشے میں محو ہوئیں۔ بلکہ تم خود ہی
لطف اٹھاتیں جو امان جان نے بچون کے کھیل سے حاصل کیا۔
میری طرف سے عابدہ کو پیار کر لینا۔ اور امان جان کے
حضور میں تسلیم عرض کرنا۔ فہیم۔ نسیم۔ اور نعیمہ آداب گزارہ ہیں۔

فہیمہ

خط (۲)

برابردالی رشتہ کی بہن کے نام

۱۱- جولائی ۱۹۵۵ء

رقیہ بہن۔

آج چوتھا روز ہے کہ میں برابر تم کو بلا بلا بھیجتی ہوں۔
مگر تم نہ تو آتی ہی ہو نہ یہ بتاتی ہو کہ کب تک تمہارا انتظار کروں۔
مجھے تم سے ایک ضروری امر میں مشورہ کرنا ہے۔ عالیہ کی
نسبت کا معاملہ بھی بغیر تمہاری صلاح کے طے نہیں ہو سکتا۔ یا تو
خود آؤ۔ یا یہی کہلا بھیجو کہ مجھے فرصت نہیں۔ تو ہی آ۔ میں تم کو
تکلیف نہ دیتی اور بغیر بلائے خود چلی آتی۔ مگر ادھر تو عالیہ کئی
دن سے اچھی نہیں ہے۔ ادھر میرے پاؤں میں ایک دانہ
نکلا تھا وہ پک گیا ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہوں اور کام ایسا
ضروری آپڑا ہے جو مٹالے نہیں ملتا کہ دس پانچ دن انتظار کروں۔

خالہ امی پر سون آئی تھیں۔ اُن سے معلوم ہوا کہ سنبھلی باجی بھی بنارس سے آنے والی ہیں۔ وہ آجائیں گی تو اور بھی تم کو صدمہ نہوگی۔ پھر تو نہ آنے کا کافی بہانا مل جائے گا۔ جس طرح بنے۔ آج نہیں توکل۔ ضرور ضرور دو گھڑی کے واسطے آجاؤ۔ عالیہ کہتی ہے کہ زبیدہ کو بھی لیتی آئے گا۔

خبر نہیں اُن بنارسی گلابدن کے تھانوں کا کیا حشر ہوا۔ جو میں نے تمہارے پاس بھیجے تھے۔ کہ بھائی امداد سے قیمت ٹھہرا چکا کر مجھے لے دو۔ لے ہے۔ کیا افیون کھانے لگی ہو۔ پینک میں رہتی ہو۔ ماجر کیا ہے کہ کسی بات کا ٹھیک جواب ہی نہیں دیتیں۔ یاد کر کے وہ تھان بھی لیتی آنا۔ چھوٹی دو لہن اور بھابھی جان میری جان کھا رہی ہیں۔ کہ تھان کیا ہوئے۔ بھائی امداد تو بھلا یہاں کیوں آنے لگے۔ اُن سے کہو کہ خود آئیں تو افضل ہی کو بھیج دیں۔ کیسا دل پٹھر کر لیا ہے کہ

ایک شہر میں رہ کر ہینون بھولے سے بھی یاد نہیں کرتے۔

صبا پرہ

خط (۳)

ہجولی کے نام

۱۲ جون ۱۹۰۹ء

واہ بہن صفیہ

آپ ہی ظلم کرو آپ ہی شکوہ اٹھا

سچ ہے صاحب روش الٹی ہے زمانہ اٹھا

آپ ہی تو تم حسینہ کی گڑیا کے بیاہ والے دن مجھ سے لڑ پڑیا

اور آپ ہی نفیسہ عالیہ اور رابعہ سے میری شکایت کرنے ڈڑی گئیں

بھلا سچ کہو میں نے ایسی کیا بات کہی تھی جس پر تم اس قدر

تک گئیں۔ یہی ناکہ جب تمہاری جڑاؤ بانی کھو گئی تب میرے منہ

سے نکلا کہ اتنے بھیڑ بھڑکے اور وہ بھی موئی گڑیا کے بیاہ میں تم کو

اتنا زیور لاونے کی کیا ضرورت آپڑی تھی۔ اب بھگتو بہت سا کہنا

لاونے کی یہی سزا ہے۔ اس پر تم نے مجھے نہ معلوم کیا کیا کہا۔ مگر

میں نے بھی کچھ کہا، اچھا بڑا کوئی لفظ زبان سے نکالا؟ ذرا
انصاف کرو کہ کس کا قصور ہے۔ میں نے حصہ بھیجا تم نے پھیر دیا
میں نے خیر صلاح کو مانا بھیجی۔ تم نے اُس سے بات نہ کی۔
اے بات کرنا کیسا بات کا جواب تک نہ دیا۔ وہ اپنا سامنہ لے کر
پلٹ آئی۔ لیکن مجھے تو اب بھی نہ تم سے شکایت ہے نہ رنج۔

تم خفا، ہم سے ہو ہم تم سے نہیں آزرہ

ہم سے ہے رنج تھیں تم سے ہیں رنج نہیں

مگر بہن انا تو ضرور کہوں گی کہ ایسی خفگی اور ایسی ہی مزاج

کی تیزی ہے تو اللہ حافظ ہے میں تو اُلٹی معافی مانگ بھی لوں

مگر تم تو بھری بیٹھی ہو۔ کوئی ہنسی کی بات میں یوں نہیں بگڑاؤ گتہ

میرا اللہ جانتا ہے کہ میں نے تم پر آوازہ نہیں کسا تھا۔ بھلا یہ تو

کہ کبھی اور بھی میری طعن کی زبان تم پر کھلی تھی۔ یا اُسی دن میرا دم

ایک دم سے خراب ہو گیا۔ کہ آپ ہی آپ تم پر آوازے کسے لگا

جب میں نے تم سے کہا تھا تب کوئی غیر تھا بھی تو نہیں۔ میں۔
 تم۔ صالحہ حلیمہ۔ اور بہن زینب بس یہی پانچ آدمی تھے سب
 آپس کے وہی لوگ جو ہمیشہ مہنسی مذاق میں شریک رہا کرتے
 ہیں۔ مگر تم تو اس روز ہوا کے گھوڑے پر سوار تھیں۔ غصے کی پٹ
 باندھ کے ساتھ لائی تھیں۔ منہ چھوتے ہی پھر اٹھیں۔ گرج کے
 برس پڑیں۔ لے خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب معاف کرو۔ بہنیں بہنیں
 لڑتی نہیں ہیں آؤ مہنس دو۔ ار ریل جاؤ۔

عجبت تم اپنا رکاوٹ سے منہ بناتی ہو
 وہ لب پہ آئی مہنسی دیکھو مسکراتی ہو

مفت کی گنہگار

رقیہ بانو

خط (۴)

ہم میں مامون ادبہن کے نام

۹ ستمبر ۱۹۰۶ء

صدیقہ بہن

میں تو تم سے عاجز ہوں۔ آخر یہ تم کو ہوا کیا ہے۔ کل
 ٹرک کے مین نماز اور قرآن شریف سے فراغت کر کے آپ کے
 حضور میں حاضر ہوئی۔ تو آپ لمبی تانے بے خبر سو رہی تھیں۔
 عشا کے بعد کھانے پینے اور نماز و نطیفے سے فارغ ہو کے آئی
 تو پھر آپ کو دراز پایا۔ جی تو جل گیا کہ یہ کون بڑی عادت ہے
 مگر خیر چپ چاپ چلی آئی۔ آج صبح کو نو بجے کے قریب اتفاقاً
 ایک کام کے لئے پھر میں تمہاری طرف نکلی تو کیا کہوں کہ کتنا
 غصہ آیا۔ مانی جان نے کہا کہ صدیقہ تو سو رہی ہے۔ جی میں
 آیا کہ امی جان سے کہ دوں۔ وہ اچھی طرح تمہاری خبر لین۔

ممانی جان بیچاری کا کہنا تو تم مانتی نہیں ہو مگر پھر میں نے یہی مناجا
خیال کیا کہ پہلے تم کو مطلع کر دوں۔ شاید میرے کہنے اور امی جان
کے ڈر سے تم یہ عادت چھوڑ دو۔

تم کو معلوم ہے کہ ہماری امی جان لڑکیوں کے سرِ شام
سُور ہننے اور دن چڑھے اُٹھنے پر کس قدر برہم ہوتی ہیں۔ کچھ
یاد ہے کہ کتنی خفگیان اس کے واسطے اُٹھانی پڑی ہیں۔ اور
پھر وہی بات بلکہ اُس سے بڑھ کر کہ نماز کلام مجید اور وظیفہ سب
موقوف۔ دن سونارات سونا۔ ایسی نیند بھی کیا کہ انسان خدا
کو بھول جائے۔ بھلا سوچو تو سہی کہ تم تو شام سے نیند کی مانتی رہی
بچھونا لو اور ممانی جان گھر کا دھندا دیکھیں۔ بچوں کو بھلائیں کھلائیں
سویرے اُٹھ کے اُن کا منہ دھلائیں۔ ناشتہ کرائیں۔ گھر کی
صفائی دیکھیں۔ کھانا پکوائیں۔ ماموں میان کو کھانا کھلائیں۔ کپڑی
کے لیے پان بنائیں۔ جب وہ ان تمام کاموں سے فراغت کر لیں۔

تو آپ ناک بھون چڑھاتی منہ بگاڑتی تو دس بجے پلنگ سے اٹھیں۔ غرض دین کی نہ دنیا کی۔

میں نہیں جانتی بہن تم نے اپنی زندگی کا مقصد کیا قرار دیا ہے۔ خدا کے کام کی تم نہیں۔ مان کے آرام کی تم نہیں۔ باپ بھائی۔ بہن۔ عزیز اقارب۔ نوکر چاکر۔ کسی کو تمہاری ذات سے چین ہے؟ کون تم سے خوش ہے؟ صدیقہ بہن مجھے تم سے اس قدر محبت ہے کہ میرے سامنے جب کوئی تم کو بُرا کہتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ ہی کو کہا۔ اس لئے میں تم کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

بُرا نہ ماننا وہ مثل نہیں سنی؟ کوئی اپنی آنکھ کی پھٹی خود نہیں دیکھتا ہے، مطلب یہ کہ اپنا عیب خود نہیں سوچتا دوست کا فرض ہے کہ دوست کی جھوٹی تعریف کر کے اس کو دھوکے میں نہ ڈالے اور اُس کے عیوب سے اس کو مطلع کرتا ہے۔ عیوب سے

مطلع کرنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو ہمدردی سے
مقبولیت سے۔ سچائی اور صفائی سے تنہائی میں سمجھانے کے طور پر
کہتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں زیادہ نہیں ہیں۔ دوسرے وہ جو علانیہ کہتے
اور اعتراض کرتے ہیں۔ برا کہتے اور برا کہلو کر خوش ہوتے ہیں۔

کچھ شک نہیں کہ یہ عادت نہایت بُری ہے مگر بہن میرے
نزدیک جھوٹی تعریف اور یہودہ خوشامد کرنے والوں سے یہ لوگ ضرور
بہتر ہیں۔ خوشامدی ہم کو دھوکے میں رکھ کر خود پرست اور خوشامد پسند
بنادیتے ہیں اور معترض ہم کو اس قسم کے نقصانات نہیں پہنچا سکتے
بلکہ ہم چاہیں تو ان کے اعتراضوں سے نفع اٹھا سکتے ہیں۔
تم کہو گی کیونکر۔ سنو۔ معترضین ہم پر سیکڑوں اعتراض کرتے ہیں۔
اگر ہم غور کریں تو جہاں ان میں سو غلط ہوں گے وہاں ایک دو
سچ بھی نکل آئیں گے۔ اب جو دو صحیح ہیں ہم ان کو چھوڑنے
کی کوشش کیوں نہ کریں۔ اچھا اب میں خط کو ختم کرتی ہوں۔

مانو تو اتنا ہی لکھنا بہت ہے۔۔۔ مانو تو دفتر سیاہ کرنا بھی فضول۔
 مگر مجھے امید ہے کہ ایک بہن اور دوست کی محبت کی بھری
 رائے پر تم ضرور کاربند ہوگی۔

آج میں تمہارے گھر نہیں آسکون گی۔ کیونکہ کل ہمارے
 یہاں عید مولود ہے۔ مجھے آج ہی سب انتظام کرنا ہے اور
 مس صاحب بہت سا کام دے گئی ہیں وہ بھی ختم کرنا ہے۔ ظہر کی
 نماز پڑھ لوں تو دھندوں میں مصروف ہوں۔ تم آج سہ پہر کو آ جاؤ
 تو بہتر ہے۔ جی بھی پہلے گا اور میرا کام بھی بٹ جائے گا۔ مانی جان
 تو کل صبح سے ضرور ہی آئیں گی۔

تمہاری عقیلہ بانو

خط (۵)

منہ بولی بہن کو

ازالہ آباد - ۹ جنوری ۱۹۰۷ء

بہن روشن آرا

بیٹے کی شادی مبارک۔ مگر مجھے تو تم نے خوب ہی بلایا

بقول امیر۔

ہو چکا عیش کا جلسہ تو مجھے خط بھیجا

آپ کی طرح سے مہان بلائے کوئی

شادی کی تاریخ مقرر کی انیس۔ اور مجھے خطرہ وانہ کیا سولہ کو۔ جو

اٹھا رھوین کو شام کے وقت مجھے ملا۔ اگرین تیار بیٹھی ہوتی اور

اسی وقت سوار ہو جاتی۔ تب بھی کہین بیس کی صبح کو پہنچتی۔

وہیں کچھ مین مہترانی تو ہون نہیں۔ کہ جب شادی کے مہان

مرمیدا کر کے چلے جاتے تو مین جھاڑ و پنچے کے صاف کرنے

آتی۔ تم کو اگر میرا بلانا سچ مچ منظور ہوتا تو دس بارہ روز پہلے خبر
 کرتیں۔ یوں بھی کوئی کسی کو بلاتا ہے ؟ مجھے تو خیر تم سے کیا شکایت
 ہوگی۔ تم میری چھوٹی ہو۔ اے وہ چاہے پانچ چھ مہینے ہی سہی۔
 مگر اس کی مجھے بڑی ندامت ہے کہ تمہارے بہنوئی اور اُن کی
 ماں بہن سب ہر دم مجھے چڑھاتی ہیں۔ کہ آپ کی گُنیان بہن نے
 خوب بُلایا۔ اور میں جھپک کے رہ جاتی ہوں۔ کچھ کہتے نہیں بنتی۔
 میں تو میں۔ تمہاری سگی بھانج حشمت بہو کل کٹرے میں
 ملی تھیں۔ اور اس قدر تمہاری شکایت کرتی تھیں کہ کیا کہوں۔
 ایمان کی یہ ہے کہ شکایت حق بجانب ہے۔ اُن بیچارے
 نے برسوں میں جوڑ جوڑ کے تمہارے میان کے۔ تمہارے
 اور بچوں کے جوڑے بنائے۔ مُنہ دکھائی کے لیے سونے کے
 پھلے تیار کرائے۔ دولہا دُھن کے کپڑے اپنی حیثیت کے
 موافق خاصے بھاری سلوائے۔ ظاہرات ہے کہ اُن کی آمدنی ہو

کیا ہے۔ بھائی تمہارے پچاس کے نوکر۔ ہنگامان۔ ننھے
 ننھے بچوں کا ساتھ۔ برادری کا خرچ۔ وہی بیپاری ہے
 جو اس آمدنی پر ایسے اُبلے کارخانے سے گزر کرتی ہے۔ شاہاش
 ہے اس کے سلیقے اور کفایت کو۔ خیر تو یہ سب کچھ ٹھیک
 کر کر کے اُنھوں نے رکھا تھا کہ نند کے لڑکے کی شادی میں
 خالی ہاتھ نہ جاؤں۔ ورنہ نند کا دل چھوٹا ہوگا۔ اور تم نے یہ
 قیامت کی کہ مجھے تو خیر خط بھی لکھا۔ مگر بھائی اور بھانج کو بھوٹ
 منہ بھی نہ پوچھا۔

تمہاری تو اُونگھنے کی عادت ہے بس شادی سے
 چار دن پہلے چونکی ہوگی۔ پھر اور کیا ہوتا۔ بہن شادی بیاہ ہو
 یا کوئی کام۔ سلیقہ مند بیبیوں کا یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ مہینوں اور
 برسوں پہلے چُپکے چُپکے سارا انتظام کرتی ہیں۔ مہمانوں کے
 ناموں کی فہرستیں بناتی ہیں۔ اُنھیں مہینہ بیس دن پہلے خط

بھجاتی ہیں۔ جس کو خطیہج دیا جائے۔ اُس کے نام پر فرست
مین صادر کر دیتی ہیں کہ ہزار کامون مین کسی کا نام دھیان سے
نہ اُتر جائے۔ جو پھر شکایت ہو۔

مگر تمھاری سدا کی یہ عادت ہے کہ پہلے سے خبر نہیں
ہوتیں۔ وقت پر پکار مچاتی ہو۔ آخر اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ آج
سب ہی کو تم سے گلے ہیں۔ اور کیون نہوں۔ تم نے ہر سون
پہلے تو ہر ایک کو نیوت رکھا تھا۔ اور بلا نے کے وقت یہ گل
کھلایا۔ بہن کیے کے سونا نام نہ کیے کا ایک نام۔ اس سے تو
یہی بہتر تھا کہ تم کسی کو خبر نہ کرتیں جو یہ کہنے کو تو ہوتا کہ بھئی چپ
چپاتے نکاح کر دیا۔ کسی کو بلا نام منظور نہ تھا۔ پہلے سے اتنی
ہا ہا ہو ہو کیون مچا رکھی تھی۔

ہم تو ہمیشہ تم کو سمجھا یا کیے کہ بہن اپنی یہ عادت چھوڑو
اور جو کام کرنے والی ہو پہلے سے اُس کا بیٹا کر لیا کرو۔ مگر تم

سُن کے اس کان سے اُس کان اُڑاتی رہیں۔ اور آخر اپنے
 ان ڈھنگوں سے خود کو بھی فضیحت کرایا۔ اور ہم کو بھی ہنسوا یا۔
 اب پچھتا ئے ہوتے ہیں کہ جب چڑیاں چاک گئی تھیں کھیت۔
 اور کیا لکھوں۔ اللہ تم کو نیک توفیق دے۔ چار بچوں کی مان
 اور ایک بہو کی ساس بن کر تو سمجھ آئے۔
 بچوں کو پیار کرو۔ دُلہن کو اور احمد حسن کو دعا کرو۔
 زینب سلام کہتی ہے۔

امیر النساء

خط (۶)

بچاڑا دہن کو

۲۷ مارچ ۱۹۷۰ء

اچھی آپا جان

کل میری گڑیا کا بیاہ ہے۔ آپ بھی آئیے اور حلیمہ کو
 بھی لیتی آئیے۔ حلیمہ آجائیں گی تو ذرا میرا ہاتھ بٹ جائے گا۔
 بہت سے مہمان آنے والے ہیں۔ دو لٹھا والے کسی طرح
 راضی نہ ہوئے۔ نہیں تو میں چپ چپا تے شرعی نکاح کر دیتی
 اور ویسے کی دعوت میں سب کو بلاتی۔ مگر وہ لوگ رنجیدہ ہونے لگے۔
 اور بولے کہ ہمارا اللہ آئین کا ایک ہی بچہ ہے۔ ہم تو
 دل کا حوصلہ نکال کے رہیں گے۔ مجبور ہو کے مجھے بھی کچھ نہ کچھ
 کرنا ہی پڑا۔ اُن لوگوں کا رنجیدہ کرنا تو گوارا نہوا۔

حلیمہ سے کہیے گا کہ واہ بیوی تم نے خوب دھوکے میں

رکھا۔ جینر کے چار جوڑے جو تم سالہ مانگنے کو لے گئی تھیں وہ
 اب تک نہ بھیجے۔ مجھے ہتیرے کاموں میں اتنی فرصت نہیں
 کہ اُن کو غلطی سے خط لکھوں۔

میری آپا جان ضرور میرا پیام اُن کو پہنچا دیجیے۔ اور
 آج ہی سہ پہر تک اُن کو لے کے آپ آجائیے۔ دو لہا بھائی
 کو کل بلاؤں گی۔ آج تو صرف عورتوں کا بلاوا ہے۔

حسینہ

خط (۷)

بڑے بھائی کو

لاہور۔ ۶۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء

پیارے بھائی صاحب آداب عرض کرتی ہوں۔

آپ کا خط ۲۸ ستمبر کا لکھا ہوا آج ۶۔ اکتوبر کو مجھے لاہور میں

ملا۔ لفافے پر مراد آباد کا پتہ لکھ دیا تھا۔ میں آپ کو لکھ چکی تھی۔ مگر شاید

اُس وقت خیال سے یہ بات اُتر گئی کہ میں بھی ۱۹۔ ستمبر کو

آبا جان کے ساتھ لاہور کا ارادہ کیے ہوئے ہوں۔ لکھنؤ کی حکین

کے دو تھان جو پچھلے ہفتے آپ نے بھیجے تھے اُن میں پیچھی

کا مجھے پسند نہیں ہوا۔ البتہ مڑی کا اچھا تھا۔ وہی یہاں چھن گیا۔

آپا جان لپا اٹھیں تو مجھے دینا ہی پڑا۔ جب آپ آئیں تو دوسرا

ہی ایک تھان اور لیتے آئیں۔

یہاں پہونچ کے راہ کی تکان سے خالہ امان کی طبیعت

کچھ بے لطف ہو گئی تھی۔ اب اچھی ہیں۔ امی جان کچھ تو ان کے
 علاج میں مصروف رہیں۔ اور کچھ ملنے والوں میں گھر گئیں۔
 ابھی تک بیبیان آتی جاتی رہتی ہیں۔ اباجان بینک میں پرامیٹر
 نوٹوں کی خرید و فروخت کے اُبھیڑوں سے فرصت نہ پاسکے ان
 وجہوں سے ابھی مجھے سیر کا پورا موقع نہیں ملا۔ کل سب کے
 ساتھ میں نے صرف مسجد دیکھی تھی دہلی کی سی تو نہیں۔ مگر ابھی
 ہے۔ آج صبح کو شالا مار دیکھا۔ خالہ امان پہلے دیکھ چکی تھیں۔ وہ
 آج نہیں گئیں۔ میں پچھلے سال کشمیر کا شالا مار باغ دیکھ آئی تھی۔
 دونوں کی شکلیں کچھ ملتتی جُلتی ہیں تھوڑا سا فرق ہے یہاں کئی تختے
 ہیں اور ہر تختہ ایک دوسرے سے نیچا ہے۔ پھر کچھ آراستہ بھی
 ہے۔ کشمیر کا باغ تو ایسا اُجڑا پڑا ہے کہ کہنے کو باغ ہے اور
 دیکھنے کو جنگل۔ مگر وہاں کے شالا مار کو قدرت نے جو حسن دیا ہے
 وہ اسے کہاں میسر۔ سبزے سے اہلہاتے ہوئے زمر د کے سے

پھاڑ چنار کے بڑے بڑے درخت۔ برفستانی جھرنے۔ کوہستانی
چشمے اور مختلف رنگوں کے خود رو پھول یہاں کہاں۔

اس وقت دن کے تین بجے ہیں اور چار بجے کچھ
خاتونیں آنے والی ہیں۔ مین نے خانہ باغ میں گارڈن پارٹی
کا انتظام کیا ہے اس سبب سے خط کو ختم کرتی ہوں۔ پھر دوسرے
خط میں اور حالات لکھوں گی۔ بھائی جان سے میری تسلیم کہ دیجیے گا
ابا جان۔ امی جان اور خالہ اماں نے سب کو دعا کہی ہے۔

آپ کی کینز فاطمہ

خط (۸)

بڑے بھائی کو

لاہور۔ ۹۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء

پیارے بھائی جان بندگی عرض
 بھائی صاحب کو جو خط لکھا ہے اس میں لاہور کے
 شالامار باغ کی مختصر کیفیت لکھ چکی ہوں۔ کل ہم جاگیر کا مقبرہ
 دیکھنے گئے تھے۔ مقبرے کی خوبصورتی۔ نفاست نزاکت
 کس کس بات کی تعریف کروں۔ ان سب پر طرہ اُس کا استحکام
 ہے۔ وہ کیسے کاریگر تھے جنھوں نے اس کو بنایا اور کتنے
 باہمت اور نازک خیال تھے وہ لوگ جنھوں نے بنوایا۔ آج
 بہت سے لوگ اُن کا نام بھی نہیں جانتے لیکن دردمند دلون
 میں اُن کی یاد ہمیشہ رہے گی۔ آہ اُس میں کس کا جسم ہے۔
 ہندوستان کے عظیم الشان بادشاہ۔ شاہ جہان کے باپ

اور اکبر کے سے مدبر شہنشاہ کے بیٹے نور الدین محمد جہانگیر کا۔
 جس نے ایک اشارہ میں سیکڑوں کو صاحب تاج و نگین
 کر دیا ہو گا وہ آج تخت و تاج اور فاتحہ کو بھی محتاج ہے۔
 فاعتر وایا اولی الالبصار۔

یہاں سے کچھ فاصلہ پر شاہ درے کے قریب نور جہان بگیم
 کے مقبرے کا ٹوٹا پھوٹا برج نظر آ رہا ہے ریل کی سڑک کو
 طے کرتے اور جھاڑیوں جھنکار یوں میں اُبھکتے ہوئے اُس
 مشہور زمانہ ملکہ کی قبر دیکھنے کو بھی ہوئی۔ اُف نہ پوچھیے کہ قبر دیکھ کر
 دل پر کیا گزر گئی۔ وہ ناز پروردہ۔ نازک دماغ اور نازنین ملکہ
 اس ٹوٹے سے کھنڈرا اور اُبڑے مقام پر ہزاروں سن مٹی
 کے ڈھیر کے نیچے دبی پڑی ہے۔ گنبد کی شکستہ دیواروں
 پر کو لے سے کسی نے لکھ دیا ہے۔

برمزارِ باغِ یابان نے چراغ نے گلے

نے پر پروانہ آید نے صدائے بلبلے

اس گنبد میں تین قبریں ہیں۔ تینوں ٹوٹی پھوٹی جن پر لوح مزار تک باقی نہیں۔ خبر نہیں ان میں سے کون اُس عالی جاہ ملکہ کا مسکن ہے۔ میری تو یہ حالت ہو گئی کہ بید کی طرح کانپتی تھی اور رو رو کے فاتحہ پڑھتی جاتی تھی۔

ہمارے ساتھ ایک میم صاحب بھی تھیں۔ مجھے روتا دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ تم کیوں روٹا ہے۔ اس کبر میں ٹمارا کون ہے۔ جواب تو نہایت اچھا ممکن تھا۔ لیکن کچھ سوچ سمجھ کے میں نے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کی کہ اس سے زیادہ آپ کو میں کیا بتاؤں کہ اس میں ہماری مٹی ہوئی عظمت اور شوکت کی یادگار یعنی ہندوستان کی مشہور ملکہ دفن ہے۔ اور اس قبر کو دیکھ کر ہمیں اپنا پچھلا وقت یاد آ رہا ہے اُسی کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ ایک دن ہمارے واسطے بھی یہی زمین اور

یہی مٹی کا ڈھیر ہے۔ وہ تو ملکہ تھی اس وجہ سے ٹوٹا پھوٹا ہی
 سہی مگر کچھ نشان تو باقی ہے۔ ہم جو اتنا اکڑتے اور غرور کرتے
 ہیں تو کس پر تے پر۔ ہمارا نام و نشان تو چند روز بھی قائم
 رہنے والا نہیں ہے۔ زیب النساء کی قبر بہت تلاش کی کہیں
 پتہ نہ چلا۔ دو بجے کے قریب گھر واپس آئے۔

امید ہے کہ آپ اور بھائی صاحب بخیریت ہوں گے
 میری طرف سے چچا میاں کو تسلیم کہہ دیجیے گا۔

آپ کی

فاطمہ

خط (۹)

چھوٹی بہن کو

از علی گڑھ ۱۳- اکتوبر ۱۹۰۹ء

میری پیاری بہن

تمہارا خط ملا تھا۔ جواب میں کسی فتہ درویر ہو گئی۔

اس لیے کہ ہمارے یہاں جلال بے آئے ہوئے تھے۔ جو
 بجٹی کے ترکی کا نسل جنرل ہیں۔ ہم لوگوں نے اُن کی بڑی
 خاطرین کیں۔ اور سچ پوچھو تو پھر بھی جتنا حوصلہ تھا۔ اُستی نہ کر سکے
 ماسٹرون کی تاکید تھی کہ بہت جوش نہ ظاہر کیا جائے۔

تم نے تو خوب سیر کی۔ ہم کو اتنا موقع ابھی کہاں ہے کہ
 سیر سپاٹے میں وقت گزاریں۔ ہماری سیریں تو کتابوں تک
 محدود ہیں۔ ہاں انشاء اللہ طالب علمی کا زمانہ ختم ہونے پر
 آبا جان سے اجازت لے کے ہم بھی کچھ دنوں سیر کریں گے۔ تاکہ

تفریح بھی ہو اور تجربہ بھی۔ اور تم کو بھی اگر ابا صاحب اور امی جان
کی اجازت ہوئی تو ساتھ لے چلیں گے۔ تمہارے بغیر تو ہم
دونوں بھائی جنت میں بھی خوش نہیں رہ سکتے۔

وہ ہم نہیں جو کرین سیر بوستان تنہا
بہشت ہو تو نہ منہ کیجے باغبان تنہا

ایسی ہی تم سے بھی امید ہے۔

پچھلے ہفتے خط کے ساتھ میں نے ایک کتاب
”لاثانی اُستانی“ تم کو بھیجی تھی۔ تم نے اُس کی رسید نہیں لکھی۔
کیا نہیں پہنچی۔ بڑی عمدہ اور تمہارے لیے نہایت ہی
مفید کتاب ہے۔ غلطی سے خط اور کتاب دونوں چیزیں
میں نے مراد آباد بھیج دی تھیں۔ شاید کتاب عایشہ بہن نے
رکھ لی ہو۔ دریافت کرو۔ خدا کرے کھوئی نہو۔ تم اُسے ضرور
غور سے پڑھنا۔ ایشیا کا نقشہ اور اردو کی تفسیر چڑھا ہوا قرآن مجید

بھی جلد بھیجوں گا۔

تھوڑا سا آم کا مربہ تو بنا کر بھیج دو۔ بہت دنوں سے
تمہارے ہاتھ کے پتے ہوئے کھانے کھانے کو نہیں ملے۔
مُنہ پھیکا ہو رہا ہے۔ اور ہاں وہ ولسکوٹ کیا ہوئی جو تم میرے
لیے بنا رہی تھیں۔ صنیر احمد کو سوئیٹر تول گیا۔ مگر مجھے اب تک
اُس کا انتظار ہی ہے۔ وہ مجھ کو بہت پسند ہے جلد تیار
کر کے بھیج دو۔

ابا صاحب اور امی جان کو آداب کہو۔

علی احمد

خط (۱۰)

بچھوٹی بہن کو

از علی گڑھ - ۱۸ - اکتوبر ۱۹۰۹ء

پیاری بہن

تمھاری محبت کا شکریہ کہ تم نے لاہور کے حالات ہم
 دونوں بھائیوں کو لکھ کر گویا ہم کو بھی سیر میں شریک کر لیا۔ خدا
 نے چاہا تو آئندہ سال چھٹیوں کے زمانے میں ہم لوگ تمھارے
 ساتھ کشمیر چلیں گے۔ واپسی میں لاہور کی اچھی طرح سیر ہوگی۔
 اور ہم زیب النساء کا مزار بھی تم کو دکھلا دیں گے جو لاہور سے
 تھوڑے فاصلے پر ہے۔ ہمارے امتحانوں کا نتیجہ تم کو
 معلوم ہی ہوا ہوگا۔ بھائی صاحب نوین درجے میں گئے اور
 میں آٹھویں میں آیا۔ اللہ نے تمھاری دعائیں قبول کر لیں
 اور کیون نہ کرتا جو دعا دل سے کی جاتی ہے اور سچے اعتقاد

کے ساتھ وہ ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔

تم نے یہ نہ لکھا کہ امی جان کا مزاج کیسا ہے ہم لوگ
 اُن کی خیریت معلوم کرنے کو بے چین رہتے ہیں۔ اُن کی کیفیت
 ہر خط میں مفصل لکھا کرو۔ حضور ابا کے شفقت نامے آتے
 رہتے ہیں اُن سے سب اعضا کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔
 ہماری طرف سے امی جان کے حضور میں آداب عرض کرنا
 اور خیریت کہ دینا۔

ابا صاحب تو یقین ہے کہ وہی تشریف لے گئے ہوں گے
 اور واپسی میں جب وعدہ اپنے کالج کے دوستوں سے ملنے
 ضرور آئیں گے۔ بھائی صاحب تم کو دعا کہتے ہیں۔

تمہارا بھائی

صغیر احمد

خط (۱۱)

بڑے بھائی کو

از لاہور۔ ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء

میرے پیارے بھائی صاحب تسلیم
 آج میں آپ کو ایک لمبا چوڑا خط لکھنے والی ہوں
 جس میں نہ لاہور کا ذکر ہے نہ شالامار کا۔ یہ خط کہیں کل تک
 ختم ہوگا۔ اتنی فرصت ہی مجھے نہیں ہے کہ دو تین گھنٹے
 جم کے اسے آج ہی پورا کروں۔ جو بات میں لکھنے والی ہوں
 اُسے آپ بھی شاید اُسی قدر پسند کریں گے۔ جس قدر میں
 پسند کرتی ہوں۔ یہ مضمون اور یہ قصہ آج میں نے ایک کتاب
 میں پڑھا ہے۔ اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہوا ہے۔
 آئیے ہم اور آپ دونوں مل کے ایسی کوشش کریں کہ
 نیک نام ہوں۔ اور وہی پھل پائیں جو اُس لڑکے کو ملا۔

جس کا قصہ میں آگے لکھوں گی۔ اس قصے سے بیشتر ایک
 مصرع لکھتی ہوں۔ ہماری امی جان اکثر ہم کو یہ مصرع سنا کر
 اس کے معنی اور مطلب سمجھایا کرتی ہیں لیکن آج اس مضمون
 نے اس مصرع کے معنی بالکل حل کر دیے۔ مصرع یہ ہے۔

کنند کوشش لگا کے تارے سپہ رفعت کے توڑ لاؤ

اچھا اب مضمون اور قصہ ملاحظہ فرمائیے۔

پھر کوشش کرو۔ پھر کوشش کرو

ذہن اور حافظہ دماغی قوتیں ہیں۔ بعضے دماغ قدرت نے
 ایسے بنائے ہیں کہ ان میں یہ قوتیں تیز ہوتی ہیں۔ اور بعض
 میں مدہم۔ ذہن اور حافظے کی خوبی ایک خدا داد نعمت ہے
 مگر جب تک انسان اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتا۔ اس سے
 فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا شکر محنت اور کوشش ہے۔
 دیکھو ایک چالاک گھوڑا ایک میل کا سفر بھی طے نہیں کرتا۔

جب تک تھان پر بندھا ہے۔ ایک عمدہ پُر زون کی گھڑی
 کبھی وقت نہیں بتاتی جب تک کو کی نہیں جاتی۔ کشتی ہرگز دریا کے
 کنارے نہیں پہنچتی۔ جب تک اپنے مقام سے حرکت نہیں
 کرتی۔ یہی حال ذہن اور حافظے کا ہے۔ وہ کیسا ہی اچھا ہو۔ مگر
 بدون کوشش اور محنت کے کچھ سود مند نہیں۔ ایک معمولی
 ذہن اور حافظے کا آدمی۔ اگر پورے طور پر کوشش کیے جائے
 تو وہ ترقی کی ڈور میں اچھے ذہن اور حافظے والوں سے پیچھے
 نہیں رہتا جو محنت ہی کو راحت سمجھتے ہیں اور کام کی دُھن میں
 لگے رہتے ہیں۔ وہ کیسے ہی غبی ہوں پھر بھی بازی جیت لیتے ہیں۔
 قصہ ہے کہ کسی قبضے کے مدرسے میں ایک لڑکا تھا
 نہایت غبی۔ بے حد گند ذہن۔ اُس کو آموختہ کبھی یاد نہیں
 رہتا تھا۔ وہ عادتِ خصلت کا بُرا نہ تھا۔ البتہ اپنے ذہن اور
 حافظے کی کمی کو پورا کرنے کا طریقہ نہیں جانتا تھا۔ اس سے وہ

نہایت رنجیدہ اور بے دل رہتا تھا۔ شاید ہی کوئی روز ایسا ہوتا کہ اُس کو اُستاد کی ناراضی پر شرمندہ ہونا نہ پڑتا ہو۔ یہ ایک ایسی ذلت تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے ہم جماعت لڑکوں سے جھپٹتا۔ یہاں تک کہ اُس کو کھیل کے گھنٹوں میں بھی اور لڑکوں کی سی خوشی نصیب نہ ہوتی تھی۔ روز بہ روز اُس کی نا اُمیدی بڑھتی جاتی تھی۔ اور وہ اکثر یہ خیال کرتا تھا کہ غالباً خدا نے مجھ کو لکھنے پڑھنے کے واسطے نہیں پیدا کیا ہے۔

ایک روز صبح سویرے مکتب میں حاضر ہوا۔ اگرچہ یہ صبح اُس کے حق میں سب سے زیادہ ہولناک تھی۔ مگر خدا کی مرضی یہ تھی کہ یہی صبح اُس کی خوش نصیبی کی پہلی صبح ہو۔ آج اُس کو آموختہ بالکل یاد نہ تھا۔ اُستاد نے جتنے سوال کیے اُن میں سے ایک کا جواب بھی نہ دے سکا۔ اُستاد نے معمول سے زیادہ غیرت دلائی۔ اور صاف کہہ دیا کہ اگر تم خوب

کوشش نہ کرو گے تو مجھ کو اندیشہ ہے کہ تم دنیا میں کسی کام کے قابل نہو گے۔

وہ لڑکائیہ باتیں سن کر نہایت غم زدہ ایک طرف جا بیٹھا۔ اور اوپر ہی دل سے اُسی بھولے ہوئے سبق کو پھر دیکھنے لگا۔ چونکہ اُس کے دل کو سخت صدمہ تھا۔ اور تمام بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا نہایت مایوس ہو کر اپنے ہم سبق سے جو قریب بیٹھا تھا۔ چپکے چپکے کہنے لگا کیا کوشش کروں مجھ کو تو یاد ہی نہیں رہتا۔ شاید پڑھنا میری تقدیر میں نہیں ہے۔ اُس کے ہم سبق نے کہا۔ بھائی! یاد نہیں رہتا تو کیا ہے کوشش کرو اور پھر کوشش کرو۔ مگر خدا کے واسطے ہمت نہ ہارو۔ لڑکے نے جواب دیا۔ بھائی میری تو ساری کوشش اکارت جاتی ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پڑھنا چھوڑ دوں۔ اُس کے نیک دل ہم سبق نے پھر

نرمی اور مہربانی سے کہا۔ اے عزیز جو ہو سو ہو۔ ایک دفعہ
تو اور ہمت باندھ کر کوشش کرو۔

اگرچہ اُس غبی لڑکے کا دل ٹوٹ گیا تھا مگر مہربان
ہم نشین کی صدائے کہ پھر کوشش کرو اس کی ہمت بڑھا دی
اور پھر مستعد ہوا۔ رفتہ رفتہ اُس نے معلوم کیا کہ الفاظ اور فقرے
ذہن نشین ہونے لگے۔ اور تھوڑی دیر میں سارا سبق ازبر
کر لیا۔ اور اس کامیابی سے ایسا باشاش ہوا کہ گویا اُس نے
بڑا خزانہ پالیا۔ اُس کو زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ مین آئندہ
بھی ہر ایک سبق اسی طرح جی لگا کر کوشش کروں گا تو یاد
کر سکوں گا۔ اب وہ جلدی سے اٹھا۔ اور ادب سے اُستاد
کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا ”جناب میں چاہتا ہوں
کہ میرا سبق پھر سُن لیجیے۔“

اُستاد۔ تم کس برے پر درخواست کرتے ہو۔

آدھا گھنٹا بھی تو نہیں گذرا کہ تم ایک لفظ بھی نہیں سنا سکے تھے
 لڑکا۔ بے شک جناب اُس وقت مجھ کو یاد نہ تھا مگر
 اب خدا کے فضل سے میں سب سنا سکتا ہوں“
 اُستاد۔ ”خیر سناؤ“

لڑکے نے تمام سبق فر فر سنا دیا۔ سب یاد تھا۔ یہ کہیں
 بھولائیے گا۔ اُستاد نے بہت خوشی ظاہر کی۔ اور کہا کہ اگر تم
 اسی طرح آئندہ بھی کوشش کرو گے تو میں امید کرتا ہوں کہ
 تم ایک لایق طالب علم بن جاؤ گے۔ پھر تو اُس کا یہ حال
 ہو گیا کہ مدرسے میں کوئی لڑکا اُس سے اچھا سبق یاد
 کرنے والا نہ تھا۔

بھائی صاحب اب یہ قصہ تمام ہوا اور میں یقین کرتی
 ہوں کہ اس کا اثر جتنا مجھ پر ہوا ہے اتنا ہی آپ پر بھی ہوگا
 میں تو گھر کے کاموں میں بھی مصروف رہتی ہوں۔ آپ کو

البتہ کوشش کا پورا موقع ہے۔ اس لیے کہ سوا اسکول
 کی زندگی کے اور آپ کو کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ مین ایک بار
 پھر وہ مصرع آپ کو یاد دلاتی ہوں۔

کنہ کوشش لگا کے تارے پہ فرحت کے توڑ لاؤ

آپ کی جان نثار بہن

فاطمہ

خط (۱۲)

پہچان ادا دہن کو

از بمبئی ۲۳- مارچ ۱۹۱۶ء

پیارے انجمن

معلوم ہوا کہ تمہارا ہاتھ پک گیا ہے۔ تردد ہے۔
 آخر کیونکر پک گیا۔ کچھ ڈلی کتر نے مین کاٹ لیا ہوگا۔ برسات
 تو ہے ہی۔ پک جانے پر تعجب کیا۔ انجمن آرا۔ تم پان کھانے
 کی عادت چھوڑ دو تو کیا اچھا ہو۔ اگر میرا خیال صحیح ہے اور ڈلی
 کتر نے سے انگلی کٹی ہے تو یقیناً مانو یہ اس کی سزا ہے کہ تم
 چچی اماں کے منع کرنے پر بھی پان کھاتی اور پان کے شوق
 میں اکثر اوقات بیٹھی ڈلی کتر کرتی ہو۔ بیوی بہت پان کھانے
 کی خوبڑوں کے لیے بھی اچھی نہیں۔ دانتوں کی خرابی کے
 علاوہ بہت سے نقصانوں کا سبق مین تم کو پڑھا چکی ہوں شاید

بھول گئیں۔ لڑکیوں کے لیے تو یہ شوق اور بھی بُرا ہے۔ نرم
 زبان موٹی پڑ جاتی ہے۔ لڑکیوں کا منہ بغیر پان کھائے بھولا
 بھولا صاف صاف اچھا معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کبھی پان نہیں کھایا۔ چچی اماں کبھی کہتی بھی
 تھیں کہ بیٹی کھانے کے بعد پان کھالیا کرو۔ منہ صاف ہو جاتا
 ہے۔ تو میں اُن کے کہنے سے حکنی ڈلی۔ یا لالچھی کھالیتی
 تھی اب البتہ پان کھانے لگی ہوں۔ مگر وہ بھی اس طرح کہ دن
 میں تین چار مرتبہ۔ اور نہ تو کچھ پروا نہیں۔ میرے گھر میں
 پاندان کا خرچ گویا کچھ ہے ہی نہیں۔ ہاں آنے جانے والوں
 اور مہمانوں کے واسطے پاندان ضرور سجا رہتا ہے۔ میری
 پیاری بہن۔ دیکھو تم بھی پان چھوڑ دو۔ اور یہ سمجھو کہ مونگے سے
 موتی زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

تم نے بچکے خط میں مجھ سے دو شعرون کا مطلب

پوچھا تھا۔ اُس دن فرصت نہ تھی۔ آج ایک کا مطلب لکھتی ہوں۔ دوسرا مجھ یاد نہیں رہا۔

شیخ جی صاحب فرشتہ ہوں تو ہوں

آدمی ہونا بہت دشوار ہے

شاعر کہتا ہے کہ شیخ صاحب میں تمام صفتیں فرشتوں

کی ہیں تو ہوا کرین۔ آدمیت تو اُن میں نہیں ہے۔ انسان جو

اشرف المخلوقات کہلاتا ہے تو اس لیے کہ اُس نے وہ بوجھ

اُٹھایا ہے جو فرشتوں سے نہ اُٹھ سکا۔ یعنی دین اور دنیا

دونوں کو نباہنا۔ ظاہر ہے کہ اگر محض عبادت ہی کی ضرورت

ہوتی تو فرشتے کافی تھے انسان کی حاجت نہ تھی۔ اور اگر دنیا

میں رہ کر صرف اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنا ہی سکھانا

مقصود ہوتا تو یہ غرض جانوروں سے بھی پوری ہو سکتی تھی۔

مگر خدا کو اپنی قدرت کا کمال دکھانا تھا کہ اُس نے آدمی کو

پیدا کر کے اُسے اس قدر عقل اور قوت عطا کی کہ دنیا کے تمام کاروبار پورے طور سے انجام دینے کے ساتھ ہی خدا کی محبت بھی دل میں یوں چھپی رکھے جیسے پتھر میں آگ۔ اور باوجود ہزاروں فکروں کے دنیا کے فانی ہونے کا یقین رکھ کر پیدا کرنے والے سے غافل نہ ہو۔ دنیا میں اُنکے بھی اور الگ بھی رہے۔ مطلب یہ ہے کہ سارے کام دنیا کے یوں انجام دے کہ جیسے ہمیشہ دنیا میں رہنا ہے۔ یعنی بڑے اطمینان۔ توجہ۔ اور انتظام کے ساتھ۔ اور دین کے کاموں میں اس طرح دھیان لگائے کہ گویا آج ہی مرنا ہے۔ یعنی یہ سمجھے کہ جتنا وقت خدا کے کام میں گزر جائے وہی بہتر اور غنیمت ہے۔

یہ سمجھتا رہے کہ دنیا ہمارے واسطے ہے مگر ہم خدا کے کام کے واسطے۔ اور دنیا کا ہر ایک کام ہی سمجھ کر کرے

کہ یہ بھی ہمارا ایک انسانی فرض ہے اور فرض پورا کرنا
 گویا عبادت ہی ہے۔ جو لوگ دنیا کو چھوڑ کر خدا کی عبادت
 کرتے ہیں۔ اُن سے وہ لوگ ضرور بہتر ہیں جو دنیا کو
 لیے ہوئے خدا کی بندگی سے غفلت نہیں کرتے۔ مگر
 ظاہر ہے کہ اس بارِ عظیم کو برداشت کرنے والے سب
 لوگ نہیں ہوتے۔

اسی لیے شاعر کہتا ہے کہ ”آدمی ہونا دشوار
 ہے“ جو لوگ دنیا کو ٹھوکر مار کے خدا کی یاد میں مصروف
 رہتے ہیں۔ اُن کی مثال فرشتوں سے دی ہے۔ اور
 جو لوگ دین اور دنیا دونوں کو اُسی طرح سنبھالتے ہیں
 جس طرح انسان کے پیدا کرنے سے خدا کا منشاء تھا۔
 اُن کو کہنا چاہیے کہ آدمیت کا جامہ اُن پر ٹھیک اُترا۔
 آدمیت کا معنوی پہلو شاعرون نے یہ بھی رکھا ہے

کہ خوبیان۔ نیکیاں۔ اخلاق۔ سب صفتیں جمع ہوں تو اس
 شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ شیخ صاحب چاہیں اپنی عبادت
 کی نخواست سے اپنے کو فرشتہ سمجھیں مگر وہ صفتیں جو
 آدمیت کے لیے درکار ہیں ان میں نہیں ہیں۔ فرشتہ
 ہونے کو تم اصل فرشتے کو خیال نہ کرو۔ شاعر نے شیخ پر
 ایک طنز کی ہے۔ شاعر کبھی اپنا مشرب رندانہ ظاہر
 کرتا ہے۔ اور اس مشرب کے ساتھ شیخ سے چڑھا
 رہتا ہے۔ یہ شعر بھی اسی مشرب کے ساتھ ہے اب
 تو تم اس کا مطلب سمجھ جاؤ گی۔

پچی امان اور چچا صاحب کی خدمت میں میری
 طرف سے آداب کہنا اور جلد پھر لکھنا کہ اب ہاتھ کیسا
 ہے۔ تمہارے دولہا بھائی آج صبح کلکتے گئے ہیں۔
 میں نے موزے بنانے کی مشین لانے کے واسطے

اُن سے کہ تو دیا ہے جو بھول نہ جائیں۔ اور تمہارا
 گھڑی کے لیے بھی روپے دیدیے ہیں۔
 بچے تسلیم کہتے ہیں۔

عفت آرا

خط (۱۳)

چچا زادہن کو

بھئی۔ ۲۲۔ اگست ۱۹۱۷ء

پیاری انجمن آرا اللہ تم کو خوش رکھے
 تمہارا خط پہونچا۔ چچا صاحب کی ترقی سے میں بہت
 خوش ہوئی۔ میرے لیے جو چوڑیاں چچی اماں نے بھیجی ہیں
 وہ مجھے بہت پسند ہیں۔ لیکن میں پہننے نہیں پاتی۔ سعدیہ
 دیکھ کے للچا اٹھی۔ جب پہننے کو نکالتی ہوں تب یہ ٹھنکتی ہے
 کہتی ہے کہ مجھے بھی ایسی ہی پہنائیے۔ اس کے لیے بھی
 بھیجو تب کہیں میں پہن سکوں۔ صالحہ اور سعدیہ کا ہاتھ برابر
 سمجھو۔ ہے تو یہ پانچ ہی برس کی۔ مگر شاہ الدھڑیل ڈول اور
 سمجھو آٹھ نو برسوں والوں کی سی ہے۔ تیلی زبان چینی سی ملتی
 ہے۔ باتوں میں اپنی سے دونی کے کان کاٹ لے۔ گڑیا

جو تم نے بھیجی ہے اُس کے بڑے دُلا رہیں۔ ہر وقت
 بغل میں دبی رہتی ہے۔ ایک ایک کو دکھائی جاتی
 ہے اتر اتر کے کہتی ہے ”دیکھو یہ دُریا ہمیں تھالہ جنیان
 نے بھیجی ہے“ (دیکھو یہ گُریا ہمیں خالہ جنیان نے بھیجی ہے)
 رات کو پاس سلا کے منہ اندھیرے جگائی جاتی ہے۔ آج
 صبح ضد کیے ہوئے تھی کہ میں تو اسے وضو کراؤں گی۔
 بہت سمجھائے بُجھائے پانی سے بچی رہی۔ لیکن نماز پڑھائی
 گئی۔ اور قرآن شریف کا سبق اُس کو دیا گیا۔ ایک بڑا فائدہ
 یہ ضرور ہوا کہ گُریا کے پڑھانے میں سعدیہ اپنا سبق خوب
 یاد کر لیتی ہے۔

تم نے جس شعر کا مطلب پوچھا تھا وہ میرے دھیان
 سے اُتر گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ اُسے سلی نے یاد کر لیا تھا۔ آج
 مجھے خط دھونڈتے دیکھا تو پوچھا کہ آپ کیون دھونڈتے ہیں۔

میں نے کہا اُس میں ایک شعر لکھا ہوا تھا۔ اُس نے پڑھ کر
پوچھا کہ کیا یہی۔

حُسن سیرت گزرنے ہو تو حُسن صورت کچھ نہیں
(شوقِ قدائی)
ہم کو ایسی عارضی شے کی ضرورت کچھ نہیں

تم نے لکھا ہے کہ ”حُسن سیرت اور حُسن صورت دونوں
کافرق مجھے سمجھا دیجئے“ حُسن سیرت طبیعت کی خوبی کو کہتے
ہیں۔ جس میں وہ تمام بھلائیوں داخل ہیں جو آدمی میں پائی
جائیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔
ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو دنیا میں عزیز بنا دیتی ہے
میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ حُسن سیرت میں تمام بھلائیوں
داخل ہیں۔ تو اب تم یوں سمجھو کہ کوئی نیکی چاہے وہ کسی انسان
کے ساتھ ہو چاہے حیوان کے ساتھ۔ اخلاقی ہو یا تمدنی
حُسن سیرت میں شمار کی جائے گی۔ اور اسی کی بدولت انسان

چاہے مٹ جائے۔ خاک میں مل جائے۔ مگر اس کی وہ
 نیکیاں جو حسن سیرت کی بدولت ظاہر ہوتی ہیں ہمیشہ اُس کے
 نام کو بھلائی کے ساتھ زندہ رکھتی ہیں۔ دیکھو بہت سے
 کنوئیں۔ مہمان سرائیں اور عبادت گاہیں سب حسن سیرت
 کے نتیجے ہیں۔ روزمرہ کے برتاؤ میں حسن سیرت سے انسان
 دوسروں کے دلوں میں جگہ کر لیتا ہے۔ دیکھو۔ نیکی۔ احسان
 خوش اخلاقی۔ یہ سب صفتیں حسن سیرت میں شمار کی جاتی
 ہیں۔ اور یہی عادتیں ایسی ہیں جن سے محبت بڑھتی ہے
 میل جول میں لطف رہتا ہے۔ اور جن لوگوں سے سروکار
 رہتا ہے وہ غیر بھی ہوں تو عزیز بن جاتے ہیں۔

حسن سیرت کی بہترین اور اعلیٰ ترین مثال ہمارے
 بادی برحق۔ رسول خدا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
 حسن سیرت ہی سے دنیا میں اُن کا شہرہ ہوا اور ایسا ہوا کہ

آج تیرہ سو برس بعد بھی مسلمان ہی نہیں۔ اکثر غیر قوم والے ان کے شیدائی ہیں۔

کس کو کامل انسان بننا ہوا اور جو نیک نامی کے ساتھ دنیا میں رہنا اور دنیا سے جانا چاہے۔ اُس کو چاہیے کہ اپنی سیرت یعنی عادتوں کی درستی کو سب باتوں پر مقدم رکھے۔ لوگوں سے ہمدردی کرے۔ غریبوں پر ترس کھائے۔ بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ کرے۔ جس سے ملے اُس سے تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ جھوٹ نہ بولے۔ غیبت سے بچے۔ میٹھی زبان سے بات چیت کرے۔ خدا سے ڈرے۔ ایک خدا کا ڈر ہزار نیکیوں کی جڑ ہے۔ غرض اچھی باتیں اختیار کرے۔ بُری چال ڈھال سے دور بھاگے۔ جب یہ خوبیاں آدمی میں آجائیں گی۔ تب وہ حسن سیرت کا مالک ہو جائے گا۔ حسن صورت خوب صورتی کو کہتے ہیں۔ دیکھو۔ صورت

اچھی ہوئی اور ڈھنگ بُرے ہوئے تو آنکھیں دیکھ کے خوش
ہوں مگر دل اُس سے بل کے کبھی خوش نہ ہوگا۔ لوگ بُرا
کہیں گے بُرا سمجھیں گے اور اُس سے دُور بھاگیں گے۔ وہ تو
انگار ہے۔ کہ گرم ہو تو جل جائے اور ٹھنڈا رہے تو ہاتھ کالا کرے
ایسے کامیل جُول کسے گوارا ہوگا۔ اب تم شعر کو دیکھو۔ شاعر نے
دوسرے مصرع میں عارضی کا لفظ بہت ہی اچھا رکھا ہے۔ اُن
کے معنی ہیں۔ غیر مستقل۔ جلد مٹ جانے والا۔ جلد بگڑ جانے
والا۔ خوب صورتی کا یہی حال ہے۔ کہ جو آج ہے وہ کل نہیں۔
اسے پانی کا بلبل سمجھو کہ بنا اور بگڑا۔

عارض کتے ہیں رخسار کو۔ اس سبب سے عارضی
کے لفظ نے شعر میں بڑا لطف دیا۔ مجھے میرے اُستاد نے
اس صنعت کا نام ایہام مرشح بتایا ہے۔ اب شعر کا مطلب
صاف ہو گیا۔ کہ اگر سیرت اچھی نہیں ہے تو صورت کو لے کر

کوئی کیا کرے۔ بہن یہ شعر عورت کے متعلق ہے۔ مین یہ
 کہتی ہوں کہ وہ بیوی جس کی طبیعت بد ہو۔ اپنے میان کو
 اجیرن ہو جاتی ہوگی۔ ہاں ایک بات اور سنو۔ جو تھین
 شعر کا شوق ہے تو کنبے کے کسی لائق شخص سے تھوڑا سا
 عروض اور قافیہ پڑھو۔ یون مین تم کو کہاں تک لکھتی
 رہوں گی۔

اور سب خیریت ہے۔ میری طرف سے چچا صاحب
 اوپرچی اماں کو آداب کہنا۔ مزاج پُرسی کرنا۔ اور صالحہ کو وعا
 کہنا۔ بچے تسلیم عرض کرتے ہیں۔

تمہاری بہن
 عفت آرا

۵۹
خط (۱۴)

چچا زاد بہن کو

بہن - ۱۱ نومبر ۱۹۱۷ء

پیارے انجمن آرا
تمہارا خط پا کر ایسا دل خوش ہوا کہ کلی سے پھول
ہو گیا۔ چشم بد و زخوب لکھنے لگی ہو۔ کیا کہوں بیوی سعید کی
آئے دن کی بیماریاں مجھے چین نہیں لینے دیتی ہیں۔ ورنہ
اب تک جواب لکھ چکی ہوتی۔ آج ذرا اس کی طبیعت اچھی
ہے اور اس وقت سو گیا ہے۔ فرصت بھی ہے اور
خالی بیٹھے رہنے سے جی بھی گھبرا رہا ہے۔ مین نے کہا
لاؤ اپنی انجم کو خط ہی لکھ ڈالوں۔ اچھا اب جواب کو غور سے
دیکھو۔ تم نے لکھا ہے کہ غالب کے ان دو شعروں کا مطلب
مجھے بتا دیجیے۔

نہ سو گریڑا کے کوئی

نہ کہو گریڑا کرے کوئی

روک لو گریغلط چلے کوئی

بخش دو گریخطا کرے کوئی

تم اول شعر کے پہلے مصرع پر اعتراض کرتی ہو کہ اگر

کوئی ہم کو یا کسی کو ہمارے منہ پر بڑا کر رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے
کہ ہم نہ سنیں کیا اُٹھ کر بھاگ جائیں یا کانوں میں روئی لگالیں

تمہارے اس بچپن کے اعتراض پر مجھے ہنسی آتی ہے

میری پیاری ان دو کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ہے

یعنی سننے کو ان سنا کر دو جیسے تم نے سنا ہی نہیں۔ اس سے

یہ فائدہ ہوگا کہ اول تو تم کو غصہ کے ضبط کرنے اور زبان کو اُن

بیہودہ الفاظ کے استعمال سے پاک رکھنے کی عادت

پڑ جائے گی۔ جو غیظ کی حالت میں بلا قصد ادا ہو جاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ کہنے والا تم کو خاموش دیکھ کر خود ہی نادوم ہوگا۔
 ایک اور مطلب بھی اس مصرع کا ہو سکتا ہے
 یعنی اگر تم نے کوئی نیک ارادہ یا کسی اچھے کام کا قصد
 کیا ہے۔ تو لوگوں کے بُرا کہنے کی پروا نہ کرو۔ بقول غالب
 ہونی آئی ہے کہ اچھون کو بُرا کہتے ہیں

دیکھو سرسید مرحوم کو لوگوں نے کیا کیا کچھ کہا مگر وہ دُھن کا پکا
 اپنا کام کر رہی کے رہا۔ پہلے عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ
 ہندوستان میں کیسا تازک تھا۔ مگر جب بعض مستقل مزاج
 کمرہت باندھ کے کھڑے ہو گئے اور نادانوں کی گالیوں
 اور مخالفتوں کی پروا نہ کی تو آخر اپنی تجویزوں پر عمل کر رہی
 لیا۔ آج ہزاروں عورتیں جہالت کی اندھیری کو ٹھہری۔
 نکل کے علم کی روشنی میں نظر آ رہی ہیں ہر
 فرض کرو تم کسی کتابیہ ہم مکتب کی جہان ہو تم نے

کھانے میں مذہبی احتیاط کو دخل دیا اور گوشت کے لیے
ذبیحے کی شرط کی چاہے وہ اہل کتاب کا ذبیحہ ہو۔ میزبان
نے اعتراض کرنے شروع کیے تو بے شک اس موقع
پر تمھیں غالب کی نصیحت مانتی ہوگی۔ کہ ع

نہ سُنو گُرُ اَکے کوئی

میں نے تمھارے سمجھانے کے خیال سے صرف
ایک مثال دے دی ہے۔ دنیا میں ہزاروں مرحلے ایسے
پیش آتے ہیں جن کو نہایت استقلال سے طے کرنا پڑتا ہے
جنہاں سن بڑھے گا اتنا ہی تجربہ تم کو ہوتا جاوے گا۔

دوسرے مصرع میں شاعر عیب پوشی کی تعلیم دیتا
ہے۔ یعنی اگر کسی میں کوئی بُرائی ہے یا تم نے کسی کو کوئی
بُرا کام کرتے دیکھا ہے تو دوسروں پر اس کو ظاہر نہ کرو۔
تم نے چچا صاحب سے اکثر یہ حدیث سنی ہوگی کہ لوگوں کو تم دنیا

میں لوگوں کے عیب چھپاؤ قیامت کے دن خداے رحیم
تمہاری عیب پوشی اور تمہارے عیوب سے چشم پوشی
کرے گا۔

دوسرے شعر کا پہلا مصرع یہ سبق دیتا ہے کہ اگر
کوئی شخص نیک راستے سے الگ ہو رہا ہے اور تم وقف
ہو تو تمہارا فرض ہے کہ اس کو سیدھا راستہ بتا دو۔ کم
سے کم کوشش تو ضرور ہی کرو۔ آگے اُس کا مقدر۔
اس موقع پر مجھے یحییٰ برکلی۔ (ہارون الرشید خلیفہ عباسی کے
وزیر کا ایک قول یاد آ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ انسان کو
چاہیے جو اچھی بات سُنے اُسے لکھ لے اور جو لکھے اُس
کو یاد کر لے پھر جو یاد کیا ہے وہ دوسروں کو بتائے تاکہ اس کے
علم سے دوسرے بھی مستفید ہوں۔ ایک حد تک غالب
کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا نے تم کو علم دیا ہے تو اپنے بھائیوں

یعنی بنی نوع انسان کو بُرائیوں سے دور رکھنے اور اچھی باتیں بتانے کی کوشش کرتے رہو۔ انسانی اخلاق کا مقتضا بھی یہی ہے۔

چوتھا مصرع تو بالکل صاف اور مجھ سے پوچھو تو بے مثل نصیحت ہے۔ میری رائے میں بہترین انسان وہ ہے جو کسی کے بُرے سے بُرے قصور کو بھی سہیلی اور عالی ہمتی کے ساتھ معاف کر دے اور بدترین مخلوق کے جانے کا مستحق و شخص ہے جو اتنا کم ہمت ہو کہ کسی کو معافی بھی نہ دے سکے۔ ہم اگر لوگوں کے چند قصور معاف نہیں کر سکتے۔ تو ہم کو کیا حق ہے کہ اپنے بے انتہا قصور و نواقص کے لیے خدا سے معافی کی امید رکھیں۔ سچ یہ ہے کہ جو لوگ معافی دینے کے خوگر ہیں انہیں کے جی سے کوئی اس کا مزا پوچھے۔ مامون الرشید کہتا تھا اگر لوگ جان جائیں کہ مجھے

قصورون کے معاف کرنے میں کیسا لطف آتا ہے تو یقیناً وہ ہمیشہ قصور ہی کیا کریں۔ اور یہ صرف قول ہی نہیں اس کے حالات دیکھو تو معلوم ہوگا کہ واقعی وہ بے نظیر خطا پوش عطا پاش تھا۔

لو اب تمہارے خط کا جواب اور شعرون کا مطلب تو ختم ہوا مگر مجھے جو کہنا ہے وہ رہا جاتا ہے۔ بیوی تمہارے کئی خط میرے پاس آئے اور ہر ایک میں تم نے شعرون کا مطلب پوچھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ تم اکثر دیوانہ کیا کرتی ہو۔ میں اس شوق کی مخالفت تو نہیں ہوں مگر یہ ضرور کہوں گی کہ ابھی تمہاری یہ عمر نہیں ہے۔ پہلے ضروری باتیں سیکھو عقل پختہ ہو لے تو پھر یہ شوق بھی کر لینا۔ ایسا کہ اس خبط میں پڑ کے اور ضروری کاموں کو خیر باد کہہ بیٹھو۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ کچی عمر والوں کے لیے جبر

اشعار کے مطالب سمجھنے کی پورے طور پر قدرت نہ موجود
 ایشیائی شاعری مضر ہے۔ اگر تم کو نظم سے دلچسپی ہے
 تو خیر شبلی، حالی اور اقبال کی قومی نظمیں۔ منشی امیر احمد مرحوم
 اور مولانا محسن مرحوم کا نعتیہ کلام اور مولوی احمد علی صاحب
 شوق قدوائی کی نیچرل نظمیں مطالعہ کرو۔

غالب کا دیوان اردو شاعری کی جان ضرور ہے
 تخیل کی جدت جیسی غالب میں ہے کسی میں نہیں مگر
 پیاری اس کو سمجھنا دشوار امر ہے تمہارے یا تمہاری عمر
 کے بچوں کے لیے اس کا دیکھنا اوقات ضائع کرنا ہے
 ان سیدھے سادھے دو شعروں نے تو تمہارے چھٹکے
 چھڑا دیے، پھر بھلا جو اصل کلام ہے اس کو کیا سمجھو گی
 اور کیا قدر کرو گی۔

کہو تمہارے حافظ جی روز آتے ہیں۔ واہ ری لڑکی

یہ کبھی نہ لکھا کہ کلام پاک کتنا حفظ کیا اور مس صاحب سے
 سوئی کا کام کتنا سیکھا۔ انگریزی میں کچھ مہارت بڑھائی
 یا نہیں اچھا اب کی اپنے دولہا بھائی کے نام انگریزی
 میں چٹھی لکھو اور مجھے اردو میں اپنے لکھنے پڑھنے اور
 سوزن کاری وغیرہ کے تفصیلی حالات لکھو۔

پچا صاحب اور چچی امان کو میرا آداب کہو بھیا کو دعا

تمھاری بہن

عفت آرا

خط (۱۵)

چچا زاد بہن کو

مناز منزل اکبر آباد۔ ۱۱ جون ۱۹۱۷ء

میری بھول جانے والی ساتھ کی کھیلی پیاری بہن

شا کرہ سلام شوق

تم کو مجھ سے جدا ہوئے تین برس کا عرصہ گزرا
اس زمانے میں نہ جانے کتنے انقلابات ہو گئے تم بیاہ
کے حیدر آباد گئیں اور میں اُس کے پانچ مہینے بعد لکھنؤ
سے اکبر آباد آئی۔ مان باپ کا گھر اور اپنا دلیس تم سے بھی
چھوٹا اور مجھ سے بھی اب نہ وہ دن ہیں نہ راتیں۔ نہ وہ کھیل
تماشے نہ وہ دوڑ دھوپ نہ وہ دل لگی و مذاق نہ وہ بے فکری
آہ شا کرہ اب وہ چمکتے دھمکتے دن اور تارون بھری راتیں کہاں
جن میں ہم تم ساتھ پڑھتے لکھتے۔ ساتھ کھیلتے اور ساتھ ہی سوتے

جاگتے تھے۔ اب تو یہ حالت ہے کہ تم کو کیا تمھارا خط دیکھتے
 کو بھی آنکھیں ترستی ہیں۔ کیون پیاری شاگرہ کیا یہ سب مُنھ
 دیکھے کی محبت تھی اور اب آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ والی
 مثل ہو گئی۔

یہ سچ ہے کہ میں نے بھی اس عرصے میں تم کو ایک
 ہی خط لکھا ہے لیکن اول تو تم نے اُس کا جواب نہ دیا اس کے
 علاوہ فرامیری اور اپنی حالت پر بھی نظر کرو۔ تم کو فرصت ہی
 فرصت ہے اور یہاں دن رات کی کاہش ہر وقت کی آفت
 تم چھڑے چھٹانک اور یہاں سارے گھر کا اٹالا ایک میری
 جان پر۔ ماشاء اللہ دو بچے اپنے۔ تین اُن کی بہن کے۔ ایک
 ان کی پہلی بیوی کا ان چاروں کو بھی اب تو میرے ہی سمجھو۔
 پھر اللہ رکھے بڑا کنبہ قبیلہ۔ نام رکھنے اور بچھو ہڑ ٹھہرا دینے والے
 ایک دو نہیں سوچا پس۔ اچھا کہنے اور دکھ درد میں ساتھ دینے والا

ایک ان کے سوا کوئی بھی نہیں۔ ساس بے چاری کا دم
 غنیمت تھا سو وہ بھی تپکھلے برس گذر گئیں۔ اب میں ہوں اور
 دنیا کی ہزاروں فکرین۔ تھیں کہو کہ میرا تمہارا مقابلہ کیا۔

گزرے برس جب تمہارے دوٹھکانے اُن کو لکھا
 تھا کہ وہ تم کو لے کر لکھنؤ جانے والے ہیں تب کیسی مین تڑپا
 رہ گئی۔ ان کی مان کی بیماری نے مجھے مجبور رکھا۔ ورنہ میں بھی
 جس طرح ممکن ہوتا پہنچتی۔ اسی بہانے ایک دفعہ نصرت منزل
 کی اُجاڑ چار دیواری دیکھ لیتی۔ امان جان اور اباجان کے مزاروں
 پر فاتحہ پڑھ لیتی۔ اور تمہارے ساتھ اُس میران باغ میں،
 جس میں کبھی پھولوں کے انبار تھے اور جس میں ہماری عمر
 کی سترہ خوش گوار بہاریں گزری تھیں، دو آنسو بہا لیتی۔ سچ
 کہنا شا کہ تم کو بھی وہ وقت یاد آتا ہے۔ میری طرح تم بھی اُس
 زمانے کو یاد کر کے رو دیتی ہو۔ بے چین ہو کر ایک بار پھر وہ دن

پلٹ آتے، کہ اُٹھتی ہو یا خدا نے میری ہی دل میں یہ درد
 دیا ہے۔ یا اب تو۔

وہ دن خیال ہو گئے وہ راتیں خواب ہو گئیں
 وہ دود لون کی راحتیں سب اضطراب ہو گئیں

پیارے بہن ہم تم قسمت سے جدا ہو گئے مگر ہمارے
 دلوں کو جدا ہونا چاہیے۔ خط نصف ملاقات کہا جاتا ہے اس
 نصف ملاقات سے مجھ کو کیون محروم رکھتی ہو، تم یہ طویل خط لکھ کر
 کہو گی کہ فرصت کی کمی پر تو اتنا لکھا فرصت ہوتی تو بوستان خیال
 کا دفتر ہی لکھ ڈالتیں۔ بات یہ ہے پرسوں سے میں صابرہ بیگم
 کے یہاں دو دو بڑھائی کی تقریب میں مہمان ہوں تم جانتی
 ہو کہ فضول رسموں سے مجھے دلچسپی نہیں ادھر رات بھر ڈھول
 پر ڈھول ٹوٹے۔ کڑا ہی چڑھی گلگلے پکے مرثنین چنچن۔
 ادھر میں نے اپنے سونے کے کمرے میں بیٹھ بیٹھ کے دور اتوں

میں یہ کھڑا لکھا۔ تمہیں چھوٹا سا خط لکھ کے میرا جی ہی نہ بھرتا۔
 اور گھر میں اتنی مہلت ملنے کی اُمید نہ تھی کہ دل میں جو باتیں
 بھری تھیں وہ سب قلم سے اُگلتی۔ ایک خیف سی وجہ میرا
 خط نہ لکھنے کی یہ بھی ہوئی۔

اپنے دو لہا کو میرا سلام کہنا اور مزاج پوچھنا۔ بچے
 تسلیم کرتے ہیں۔

تمہاری دور افتادہ بہن

نہرا

خط ۶

چچا زاد بہن کو

ہمایون محل حیدر آباد۔ یکم جولائی ۱۹۱۶ء

میری اچھی زہرا خوش رہو

پہلے تمھاری محبت کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور پھر
اپنے خط نہ لکھنے کی بہت بہت معافی مانگتی ہوں۔ تمھاری
شکایت میرے سر آنکھوں پر مگر زہرا پہلے میرا حال سنو
اور پھر شکایت کرو۔ میں نے مانا کہ تم اکیلے گھر کی ہو لیکن بہن ۲
میری طرح بلا میں کوئی مبتلا نہ ہو

خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تم کو نیک اور خوش مزاج شوہر دیا
تم مجھ پر رشک کرتی ہو کہ میں چھڑے چھٹانک ہوں
حالانکہ میرے لیے یہی ستم ہو گیا۔ سارا گھر بیزار۔ میان
خفا۔ کس قصور پر کہ بے اولاد ہی ہے۔ بانجھ ہے۔ صبح

اُٹھ کر میرا منہ دیکھنا بخش خیال کیا جاتا ہے۔ میرا پڑھا لکھا ہونا بھی غضب ہو گیا ہے جہاں کتاب ہاتھ میں لی یا کبھی کچھ لکھنے کا ارادہ کیا اور کسی کی نظر پڑ گئی بس آفت کا سامنا کہ اسی سے تو یہ نحوست ہے۔ بھلا مسلمان عورت قلم پچڑے اور کتاب کا کیڑا بنی رہے تو گھر میں برکت کا ہے کی ہو۔ خدا بھی کہتا ہے کہ مردوں کے سے کام کرو تو مردوں کی طرح رہو بھی (یعنی جس طرح مردوں کے بطن سے اولاد نہیں ہوتی اسی طرح لکھنے پڑھنے والی عورت بھی بے اولاد رہتی ہے) پہلے مجھے ان خیالات پر ہنسی آتی تھی۔ اب رونا آتا ہے۔

ہاں وہ مجھے لکھنؤ لے گئے تھے مگر یہ جانتی ہو کیون؟ علاج کے لیے ان کی ماں ساتھ تھیں۔ سنا تھا کہ عیش باغ کے پاس ایک کامل فقیر رہتے ہیں۔ اُن کی دعا سے اولاد ہوتی ہے اس ملک میں وہ بھی ساتھ آئیں کہ

اُن سے دعا منگوائیں۔ یقین مانو زہرا جتنا مجھے لکھنؤ جانے اور ساتھ والیوں سے ملنے کا حوصلہ تھا سب مٹی ہو گیا۔ جب تک وہاں رہی مہوت رہی۔ کسی کو یاد کرنا کیسا مین اپنے ہی کو بھول گئی۔ گئی تھی علاج کرانے ہوئی باولی۔ وہ تو مجھے پہنچا کے اور اپنی امان جان کے سپرد کر کے واپس آئے۔ مگر کہاں کی دوا کیسا علاج اُنھوں نے سب چھوڑ چھاڑنے لگے جھاڑ پھونک اور فال تعویذ میں روپیہ لٹانا شروع کیا۔ میری کیا مجال تھی کہ اُن کو زیادہ روکتی ٹوکتی۔ دو چار بار دبی زبان سے کہا کہ امان جان یہ لکھنؤ ہے یہاں کے ہتکھنڈے مشہور ہیں۔ آپ ان لوگوں کے کرشموں سے ابھی واقف نہیں ہیں بے کار روپیہ برباد نہ کیجیے۔ اتنا ڈاکٹر ان اور حکیموں کو دے دیجیے تو کچھ فائدہ بھی ہو۔ ان چال بازوں کے گنڈون تعویذ و نین اگر کچھ اثر ہوتا تو حکیم ڈاکٹروں کو کون

پوچھتا۔ مگر ہر دفعہ یہی جواب پایا کہ بس بس اپنی انگریزیت
 رہنے دو تم سیم صاحب ہو تو اپنے لیے ہم تو مسلمان ہیں ہم کو
 اپنے تعویذوں ہی پر عقیدہ ہے۔ آخر کار میں چپ ہو رہی۔ پھر
 کیا تھا فلیٹوں چراغوں اور دھونیوں کی وہ بھر مار ہوئی کہ الامان
 پلنگ میں اتنی کیلین ٹھونکی گئیں کہ پلنگ کی لکڑی اسپنج
 کی طرح سوراخ دار ہو گئی۔ میرے بدن پر گندون تعویذوں
 کی وہ بہتات ہوئی کہ میں آدمی سے روٹی کی ٹوکری اور گودڑ کی
 بقی بن گئی۔ تین مہینے بقول اُن کی مان کے ہزاروں جتن
 کیے لاکھوں پاڑے بیلے اور روپیہ پانی کی طرح بہا یا جو میرے
 نزدیک نہایت نادانی سے خاک میں ملا یا گیا، مگر کچھ اثر نہوا
 میں نے اُن کو بھی لکھا کہ ان فضولیات میں روپیہ کیوں برباد
 کراتے ہو یا تو میرا علاج کراؤ یا مجھے واپس بلا لو۔ انھوں نے
 جواب دیا کہ مجھے عورتوں کے معاملات میں دخل نہیں۔ تم

جانو اور امان جان جانین میں اپنا سامنہ لے کر رہ گئی اور
تین مہینے لکھنؤ میں جھک مار کے چھوٹے بھیا کے ساتھ
حیدر آباد واپس آئی۔

لکھنؤ میں گھر سے نکلنے کا موقع ہی کب ملا۔ مزا پر
جانے کی تو اجازت نہ تھی۔ ہان نصرت منزل اور زہرہ
پسند باغ دیکھنے ایک مرتبہ گئی تھی۔ کیا بتاؤن کیا حالت
دیکھی تھوڑی دیر رو کر چلی آئی۔ ایک دن عایشہ اور سلمیٰ
سے بھی ملنے گئی تھی دونوں کو دیکھ کر جی خوش ہوا ماشاء اللہ
اپنے گھروں میں چین سے اور خوش تھیں۔ وہ میری حالت
دیکھ کر رو دین اور میں تمہیں یاد کر کے۔ پیاری زہرا اچھا ہی
ہوا کہ ہم تم دور ہیں۔ تم مجھے دیکھ کر بہت گڑھتیں۔ تمہاری شاہرہ
اب وہ نہیں رہی جس کو تم چنچل شاہرہ کہا کرتی تھیں۔ آہ
زہرا میری قسمت نے ایسے لوگوں سے میرا پا لا ڈالا جن کے

یہاں میرے سارے ہنر عیب گئے گئے اور جن کے
 یہاں کہنے کو سونے کے محل کھڑے ہیں مگر مجھ نصیب کے
 لیے آرام نہیں۔ تم جانتی ہو مجھے روپیہ سے اُنس نہ تھا
 مسرت۔ اطمینان۔ یک جہتی۔ اور اتفاق کی خواہشمند
 تھی۔ ان کے یہاں لالے پڑے ہیں۔

میرے لکھنؤ سے پلٹنے کے بعد ہی اولاد کی
 تمنائیں ان کی مانج ان کی دوسری شادی اپنے خاندان
 میں کرادی۔ وہ اور اُن کے سب عزیز نئی دولہن سے
 خوش ہیں۔ اس لیے کہ وہ اُنھیں لوگوں کی ہم خیال ہیں
 اب سنتی ہوں کہ اُن کے اولاد ہونے والی ہے۔ چار
 مہینے ہوئے میں اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ نہ وہ ادھر
 آئے نہ یہ پوچھا کہ جیتی ہے یا مر گئی۔ دوا ظہور نہ ہیں میں
 ہوں۔ اور میرا کمرہ ہے۔ خدا مجھے موت دے تو جی جاؤں

اب اس دنیا میں میرے لیے باقی ہی کیا رہا ہے بس۔

مر جانے کی اب تو آرزو ہے

مگر نہ جانے اور کیا مصیبت سہنی بدی ہے جو زندگی ختم
نہیں ہوتی۔ بہن میں پچھلے دنوں کو یاد کروں یا آج کی حالت
پر روؤں سب سے بہتر یہی ہے کہ یہ سمجھ کر صبر کروں۔

میرے لیے نہیں ہے لطف بہار ہستی

دامانِ آرزو ہے اور خار زارِ ہستی

لو میری بتیا سُن چکیں۔ دیکھو و نادھونا نہیں میرے

لے دے خیر اور اپنی حالت پر خدا کا شکر کرو کہ تم بہت

آرام سے ہو۔ گھر کے دھندے گھر والیوں کو ہوتے ہی

میں۔ کوئی نوح ہماری طرح ہو جس کو گھر تک نصیب نہیں

کہ اُس کے دھندوں میں پھنس کر غم غلط کرے۔ تم کو اور

ہر ایک کو اپنے سے بدتر کی حالت پر نظر کرنی چاہیے تاکہ

خدا کا شکر ادا کر سکو۔ محض اسی لیے میں نے یہ غم کا دفتر تیار
 کیا ہے کہ تم میری اور اپنی حالت کا مقابلہ کر سکو۔ تم میں ابھی کچھ
 اُسنگ اور حوصلہ باقی ہے جو پکھلے دنوں کی ایسی کی آرزو مند ہو
 یہاں دل ہی نہیں تو آرزو کیا ہو۔ ع
 آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
 اچھا خدا حافظ۔ پھولو پھلو بہت سکھ دیکھو۔

تمہاری بد نصیب
 شاکرہ

خط (۱۷)

پیشی زاد بہن کو عظیم آباد ۳۔ اگست ۱۹۶۷ء

بجیا آداب

آج کل یہاں ایسی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے
 کہ گویا آسمان کا بم پھوٹ گیا ہے۔ ہمارا باغ کیسا لطف دے رہا
 بجلی کی چمک۔ بادل کی گرج۔ ہوا کی سنسناء۔
 پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ کویل کی کہک۔ پیسے کی صدا۔ پانی
 کا زور۔ مورون۔ مینڈکوں۔ جھینگروں کا شور۔ کچھ نہ پوچھے
 کہ کیا عالم ہے۔ پھولوں کے تختے جن میں مختلف رنگوں
 کے پھول ہیں آنکھوں میں گھبے جاتے ہیں۔ کوسوں تک
 سبز منجلی فرش سا بچھا نظر آتا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں جلتی
 ہیں۔ اودی اودی گھٹائیں آتی ہیں۔ کبھی ہلکی پھوہاڑتی ہے

اور کبھی موسلا دھار۔ ان گھٹاؤں میں سفید سفید بگلوں کی
قطار اور بھی مزادیتی ہے۔

میں تو بیچ والے بنگلے میں بیٹھ کے چاروں طرف
کے کوارٹھول دیتی ہوں۔ اور حضرت شوق قدوائی کی
”شغوی حسن“ کو لے کے باغ کا سین ملاتی جاتی ہوں۔

جھولے پڑتے ہیں۔ راضیہ۔ عالیہ۔ آمنہ۔ شالیستہ خانم
اور بہت سی ہمجو لیاں اکھٹی ہوتی ہیں۔ کوئی پیگ بڑھاتی
ہے کوئی ملا رنگاتی ہے کوئی پوان کا دھندالے کر بیٹھتی
ہے۔ غرض ہر ایک کے کچھ نہ کچھ دھن ہوتی ہے۔ اور کیوں
نہو یہ موسم ہی ایسا دلچسپ ہے۔

اس چل پھل میں لطف تو بہت آتا ہے مگر بجیا
میری طبیعت کچھ ایسی ہے کہ ہنستے کھیلتے ایک بار مت
پلٹ جاتی ہے۔ خدا کی قدرت کا تماشہ دل کو پھولوں کی

طرف سے کھینچ کے خدا کی طرف ڈال دیتا ہے۔ مین سوچ
 مین پڑ جاتی ہوں کہ جس نے دنیا کو ان رنگوں سے سجا ہے
 وہ خود کیسا ہو گا۔ اے ہے مین کیا کہ گئی۔ کیسا کے
 لفظ سے کہیں تم یہ نہ سمجھنا کہ مین اُس کی صورت کا خیال
 لاتی ہوں۔ توبہ توبہ کچھ مین مجسمیہ تو ہوں نہیں کہ خدا کے جسم
 کی قایل ہوں۔ اس کی ذات تو مادی اوصاف سے منز
 ہے۔ کیسا ہونے سے میرا یہ مطلب ہے کہ وہ کیسا قادر مطلق
 ہے جس کی قدرت کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ وہ خود قرآن پاک
 مین فرماتا ہے کہ تمام عالم کے دریاؤں کا پانی سیاہی کی جگہ
 صرف کروا اور پھر صرف کرو تب بھی اُس کی قدرتوں کا شمار
 نہ لکھ سکو۔ ہم غفلت کے نشہ مین چورہین۔ فانی چیزوں کی
 خوبصورتی سے لطف اٹھاتے اور اُن کی چند روزہ

۱۔ مجسمیہ اس مذہب والے کو کہتے ہیں جو خدا کے جسم کا قایل ہو۔

دل فریبیوں پر مٹے جاتے ہیں۔ اے کاش۔ ہم اُس
لازوال حسن کے دل دادہ ہوتے جو ہمیشہ سے ہے اور
ہمیشہ رہے گا۔ اور جس کے اعلیٰ ترین حسن کا تمام حسین
چیزیں ادنیٰ ترین نمونہ ہیں۔

مجھے اس زمانے میں آپ بہت یاد آتی ہیں۔ آپ
یہاں ہوتے تو میرا بھی کوئی ساتھی ہوتا۔ خبر نہیں عمہ جنیان
نے کیوں آنے کا ارادہ فسخ کر دیا اب تو اتنی گرمی بھی نہیں ہے
کہ سفر تکلیف دے۔

شروع جاڑوں میں امی جان کا قصد کلکتہ جانے
کا ہے۔ مجھ سے کہتی ہیں کہ تم اپنی بجیا کے پاس لکھنؤ
چلی جانا۔ یوں تو مجھے خوش ہونا چاہیے کہ آپ سے ملون گی
مگر امی جان کو علالت کی حالت میں تنہا چھوڑنے کو دل
نہیں چاہتا۔ اس لیے میں انکار کرتی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے

کہ آپ بھی امی جان کے ساتھ کلکتہ چلیں؟ عمہ جنیا سے
پوچھ کر لکھیے۔

میری اور سب کی طرف سے سب کو سلام و دعا۔

آپ کی
قمر جہان

خط (۱۸)

مامون زاد بہن کو لکھنؤ۔ ۲۲۔ اگست ۱۹۱۱ء

پیارے قمر جان

اب تو تمہارے طرز تحریر پر مجھ کو رشک آنے لگا ہے

خوب تر مئی کی ہے۔ ماشاء اللہ

خط اُن کا بہت خوب عبارت بہت اچھی

اللہ کرے حسن رستم اور زیادہ

کیا کہوں بہن۔ باجی امان تو مستقل ارادہ کر چکی تھیں۔ کہ شروع

اگست میں عظیم آباد آئیں گی مگر اُدھر تو صغرا بہن بیمار

ہو گئیں۔ اُدھر چھوٹی پھپی جان ہمارے یہاں آ گئیں۔

اب بھلا بھتیجی کو بیمار اور نند کو گھر میں چھوڑ کے آنے کا کیا

موقع تھا۔ مجبوراً رک گئیں۔

میرا تو بے اختیار دل چاہتا ہے کہ یہ زمانہ تم لوگوں کے ساتھ گزاریں۔ اور عثمانی جان کو دیکھتی۔ اُن کے مزاج کی ناسازی سے تر و درہتا ہے۔ اباجان کو تین مہینے کی رخصت مل گئی ہے۔ یہ تو تم کو مین پہلے ہی لکھ چکی ہوں کہ اگر رخصت ملی تو وہ اس زمانے میں اپنے ایک دوست سے ملنے شملے اور پھروان سے اور کئی جگہ سیر کرنے جائیں گے خوب موقع تھا کہ ہم اس زمانے میں تمہارے یہاں رہتے۔ صغرا بہن عنقریب اپنی سسرال جانے والی ہیں۔ لیکن چھٹی دن دیکھیے کب تک رہیں۔ اُن کے سدھارنے کے بعد یقین ہے کہ ہم لوگ عظیم آباد کا قصد کریں۔ مجھے عثمانی جان کے ساتھ کلکتے جانے کی اجازت باجی امان نے تو پہلے ہی دے رکھی ہے۔ اباجان بھی یقیناً مانع نہوں گے۔ تو آخر اکتوبر میں انشاء اللہ ہم تم ضرور ہی ملیں گے۔

ہاں بہن مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم نے ایک لیس
 مس میری کی بنائی ہوئی مجھے دکھائی تھی۔ اور کہا تھا کہ میں بھی
 اُن سے یہ نمونہ سیکھتی ہوں۔ اگر تم بنا چکی ہو تو نمونے کے لیے
 میرے پاس بھیج دو۔ مجھے بھی بہت پسند آئی تھی۔ مسٹر چارلس
 سے پوچھ کر بناؤں گی۔

باجی امان۔ پُچھی جان۔ اور صفرا بہن۔ تم کو اور سب کو
 دعا سلام کہتی ہیں۔ میری طرف سے مانی جان کے حضور میں
 آداب۔ مامون جان آج کل کہاں ہیں؟

تمھاری بہن
 عصمت آرا

خط (۱۹)

بیٹی کو

دہلی - ۸ - نومبر ۱۹۱۱ء

مان کی جان نا در جہان زندہ خوش اور آباد رہو
 کل تمھاری خلیا ساس شاہ جہان پور سے آئی
 ہیں۔ اُن سے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو گئی تھیں۔ اور مجھے
 اس لیے اطلاع نہ دی کہ میں گھبرا جاؤں گی۔ میں نے یہاں
 سے خط پر خط لکھے اور جون جون جواب آنے میں دیر ہوتی
 تھی میرا دم سوکھا جاتا تھا بارے اللہ کا شکر ہے کہ کل تمھاری
 ساس کی زبانی اور آج تمھارے خط سے خیریت معلوم
 ہو گئی۔ مجھے تو یہ تعجب ہے کہ تمھاری بیماری کی خبر تمھارے
 ساس سسر نے بھی نہ دی۔ کیا اُن کو بھی تم نے منع کر دیا تھا؟
 کہ نہ لکھنا؟ بھلا بیٹی اس ناوانی سے کیا ملا۔ آخر خط نہ آنے سے

جو ابھن اور گھبراہٹ مجھے رہی کیا اس کو تم کم سمجھتی ہو۔
 اس سے تو یہ آسان تھا کہ تمہارا حال مجھے روزانہ معلوم ہوتا
 رہتا۔ اور اس پر بھی میرا جی نہ مانتا تو میں خود تمہارے پاس
 چلی آتی۔ تم کو بھی تسکین ہوتی۔ اور مجھے بھی یہ بےقراری نہوتی۔

ہاں نادر جہان۔ ایک بات سن کر مجھے نہایت ملال
 ہوا۔ تمہاری ساس کہتی تھیں کہ تم سے اور تمہاری جٹھانی سے
 نہیں بنتی۔ بیٹی تم تو کبھی لڑا کایا جھگڑا لوند تھیں۔ اپنی بہن اور
 بھانجہ سے ہمیشہ ملی جلی رہتی تھیں۔ یہ میں نے کیا سنا۔ کیا
 بڑی صحبت نے تمہاری بھی عادت بگاڑ دی۔ نادر جہان
 اچھون کے ساتھ بھی نباہ کر سکتے ہیں۔ اگر انسان وہ ہے جو
 بڑوں سے بھی ہنسی خوشی کے ساتھ نباہ دے۔ میں وحیدہ بیگم
 کی عادت سے خوب واقف ہوں۔ اُن کی ماں (اللہ بخشے)
 ایسی کھلے دراز بی بی تھیں کہ اپنے گھر میں لڑتین تو چار گھرا دھر

آواز جاتی۔ اور ایسا ہی اٹھان وحیدہ بیگم کا بھی تھا۔ مگر بیٹی وہ
 چاہے جیسی ہوں تم اُن کی سی کیوں ہو جاؤ۔ بہر حال وہ تم سے
 بڑی ہیں۔ تم کو اُن سے لڑنا یا برابری کا دعویٰ کرنا کیا ضرور
 ہے۔ تم میری نصیحت بھول گئیں، مگر نہیں تمہاری سعادت مندی
 سے اس کی امید نہیں۔ تو یہ ہو گا کہ تم ہر وقت اُن کی باتیں
 سنتے سنتے اُلٹا کر کبھی کچھ بول اٹھتی ہو گی۔ لیکن بیوی تم کو یہ
 بھی نہ چاہیے۔ خوب سمجھ لو کہ اگر تم نیک ہو تو تمہاری نیکی اُن
 پر کبھی نہ کبھی اثر کر کے رہے گی۔ دیکھو اور ٹال جاؤ۔ سنو اور
 ضبط کرو۔ آنکھ پر سیل۔ تیوری پر بل۔ اور ہونٹوں پر اُف نہ
 آنے پائے۔ بیٹی ذات کی یہی صفت ہے جس بات کو سمجھو
 کہ وہ لوگ بُرا سمجھتے ہیں۔ اُس کو کبھی نہ کرو۔ جو اُن کی مرضی ہو
 وہی کرو۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں تم اپنے ضبط اور صبر کا
 یہ پھل پاؤ گی کہ جو آج تمہاری پرچھائیں دیکھ کے جلتے ہیں۔ وہ

گل پاتوں و ہودھو کے پین گے۔ بٹی خدمت سے عظمت
 ہے۔ یاد رکھو کہ نیکی کا صلہ ہمیشہ نیک ملتا ہے۔ امید ہے کہ
 آئندہ میں یہ بات۔ یا ایسی کوئی بات کبھی نہ سنوں گی۔

سردار دولہا کو دعا۔ اور اپنے ساس مسسر کو سلام کہو
 تمھاری بہن۔ بھاج۔ اور بھائی دعا کہتے ہیں۔

تمھاری مان
 زینت جہان

۷۔ اپریل ۱۹۱۲ء

اللہ بہن سلطانہ

کب کا بخارول میں بھرا ہوا تھا جو یون نکالا گیا میں نے
کب آنے سے انکار کیا تھا۔ بہن پرسوں میں خالہ جان کے
یہاں تھی اور کل جب تمہارے یہاں سے کہاری آئی تو
اباجان کے لیے ناشتے کا سامان لیے بیٹھی تھی اور کیک
بن رہی تھی۔ اباجان دنگ گھر ہی میں رہے۔ ناشتہ پکا کے میں
اُن کے کپڑے ٹھیک کرتی رہی۔ کیونکہ وہ رات کی گاڑی
سے الہ آباد سدھارنے والے تھے۔ آج میرا قصد خود ہی
آنے کا تھا کہ آپ کا عتاب نامہ نازل ہوا۔ اُنھ اُنھ ہم سے
دعظہ کہنے چلی ہیں۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ آدمی کے کام آدمی

آتا ہے، "خیر بس خفگی ہو چکی۔ اب غصہ تھوک دو۔"

اے لوا بھی دلھن بھپسی آگئیں۔ آج بھی نہ آسکون گی۔
 کل سویرے اللہ نے چاہا تو میں ضرور آؤں گی۔ شریفین بہن
 کو آج نہ جانے دینا۔ ایک دن اور سیری خاطر سے رہ جائیں گی
 تو کیا ہرج ہو جائے گا۔ نہ ساس گھڑین بہن نہ میان۔ خسہ
 اکیلی ہی تو بہن۔ گھر جانے کی گھبراہٹ کیا ہے۔ ماشاء اللہ
 گھڑین بیس نوکر چاکر بہن کیا گھر کی رکھوالی وہی کیا کرتی بہن۔ اگر
 دلھن بھپسی آج یہیں رہ گئیں تو کل میں ان کو بھی لاؤں گی۔
 ان کو شریفین بہن سے ملنے کا بہت شوق ہے۔

تمھاری

آصفہ

خط (۲۱)

خالد زاد بہن کو

از کلکتہ ۲۸۔ فروری ۱۹۱۳ء

اپنی جان ! تسلیم
 حامدہ کی شادی کے حالات جس قدر مفصل میں
 لکھ سکتی ہوں۔ لکھتی ہوں۔ میرے خیال میں حامدہ کی شادی
 کا طریقہ تقلید کے قابل ہے۔ اچھا اب سُنئے۔ مانجھے کی رسم
 تو ادا نہیں کی گئی۔ مگر چونکہ مشرم و حیا ہندوستانی لڑکی کا خمیر ہے۔
 حامدہ کو اُس گھر میں جہان ہر وقت شادی کے انتظام کا چرچا
 رہتا تھا۔ ماں باپ اور سب بڑوں کے سامنے چلنے پھرنے میں
 لحاظ آتا تھا اس لیے وہ آٹھ سات دن کے واسطے پائین باغ والی
 محسرا میں جس کا دروازہ بیگم صاحب کے مکان کے صحن میں ہے
 بھیج دی گئی۔ حامدہ اور ہم لوگ یعنی شمس النساء۔ اختر النساء۔ میں

اور استانی جی کی لڑکی بتولی بیگم۔ وہیں رہنے لگے۔ اس عرصے میں مین نے کوئی بات رسم کے طور پر ہوتے نہیں دیکھی۔ صبح کو معمول کے موافق جب حامدہ نہانے جاتی تو بجائے صابون کے غسل خانے میں اُبٹن رکھ دیا جاتا۔ اور حامدہ۔ بیگم صاحب کے پاس نہیں جاتی تھی۔ اسی کو مانجھا سمجھیے یا کونا۔

مین چار دن رہ کر چلی آئی تھی اور برات آنے سے ایک دن پہلے شام کے قریب پھر گئی۔ مہمان زیادہ نہ تھے۔ مین، بھابھی جان، پھپھی جان۔ اور شہین بہن، چار آدمی تو ہم تھے، تین لڑکیاں وہ جو اول دن سے تھیں ان کے علاوہ حامدہ کی پھپھی، نجم النساء۔ مانی طیبہ بیگم۔ چھیری بھانجی تاجدار دھن اور خالہ زاد بہن حنیفہ سلطان تھیں۔ شادی کے گھر میں بڑی چچ پکار مہمانوں کے ہجوم اور مہمانوں کے بچوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یا پھر اس لیے کہ ہر ایک بیوی فضول طمطراق دکھانے کو مائیں اور

دَوائیں بھر لے جاتی ہیں۔ اسی طرح مہمان بیویوں سے چوگنی
 بچکنی تعداد خوگیر کی بھرتی کی ہو جاتی ہے جو گھر میں غدر مچاتے
 پھرتے ہیں۔ یہاں اول تو مہمان عورتیں ہی گنتی کی تھیں۔
 اور جو تھیں اُن میں بھی تین چار ہی بچوں والیاں تھیں۔ تو
 ان کے لیے یہ انتظام تھا کہ شمال رُخ والا ڈیرہ خالی کر دیا گیا
 تھا جس میں چار کمرے دو برآمدے دو غسل خانے اور ایک
 صحن تھا۔ مہمانوں کی مائیں اور بچے وہاں آرام سے تھے
 پھر اس انتظام کو دیکھیے کہ اُس مکان میں مختلف قسموں کے
 چھوٹے چھوٹے بہت سے کھلونے انگریزی اور دیسی مٹھائیاں
 اور پھل وغیرہ رکھوا دیے تھے کہ بچوں کو ضد کرنے کا موقع نہ ملے
 ڈیرے کا ایک دروازہ چھوٹے چمن میں بھی ہے وہ کھول
 دیا گیا تھا کہ جی چاہے تو بچے وہاں کھیلیں۔ مائیں جب ضرورت
 سمجھتیں یا جب ماما بلائے آتی اُس ڈیرے میں چلی جاتیں۔

اور بچوں کو بہلا پھسلا کے یا کھلا پلا کے پھر شادی کے مکان میں
 آجاتیں۔ سچ کہوں مجھے تو یہ طریقہ دل سے پسند آیا۔ رات کو
 کھانے سے فراغت کرنے کے بعد شمس النساء نے ہار مونیم بجایا
 اختر النساء۔ مین۔ اور تاجدار دُلہن گانے لگیں۔ اور بتولی بیگم
 ڈھولکے کرٹھیکا بجانے بیٹھ گئیں۔ گیارہ بجے تک ہم سب
 گاتے بجاتے اور ہنستے بولتے رہے۔ خاصا لطف رہا۔ پھر
 سب نے اپنی اپنی جگہوں پر آرام کیا۔ صبح پانچ بجے معمول کے
 موافق سب لوگ جاگے۔ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کے اور
 ناشتہ کر کے چھ بجے بیگم صاحب کے پاس گئے۔ کیونکہ آج
 ساڑھے آٹھ بجے کی ریل گاڑی سے برات آنے والی تھی۔
 ہم نے پان لگائے۔ اور چاندی کی خوبصورت چنگیرون اور
 کشتیوں میں ہار۔ پان عطر شربت۔ اور چھوٹے چھوٹے گلستے
 قسم قسم کے پھولوں کے جنھیں بٹن ہول کہتے ہیں۔ سجا کے

اور نفیس کشتی پوش ڈھانک کے باہر بھیجے۔ اسکے بعد سب
 برات دیکھنے کو ٹھے پر چلی آئیں۔ باغ کے پھاٹک پر باہر کی طرف
 سرخ اطلس پر سنہری کلابتون سے ”خوش آمدید“ کڑھا ہوا تھا۔
 پھاٹک کے دونوں طرف پھولوں سے بھرے ہوئے سبز پنی
 کے گلے چُنے گئے تھے۔ اور پھاٹک کے اندر سے لے کر کوٹھی
 کے دروازے تک سرخ فرش بچا کے اُسکے دونوں طرف
 خوشنمائی سے گلے رکھ دیے تھے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر
 محرابی دروازے بنا کر پھولوں سے سجادیے گئے تھے۔ مہندی
 کی ٹیٹوں کی آڑ میں چھوٹی چھوٹی انگیٹھیاں رکھ کر ان میں اگر۔
 سہاگچی۔ اور لوبان وغیرہ سلگا دیا گیا تھا۔ جس کی خوشبو سے باغ
 اور بھی مہک اُٹھا تھا۔ نورے چل رہے تھے۔ روش کے
 دونوں طرف ملازم وردیان پہنے اور گلاب پاش لیے صاف باندھے
 قرینے سے کھڑے تھے۔ غرض نفیس سجادٹ کا کوئی دقیقہ

اُٹھانہ رکھا گیا تھا۔ پونے نو بجے کے قریب چار موٹر کار سڑک پر نظر آئے اور آنا فانا باغ کے پھاٹک پر پہونچ کر رُک گئے۔ جو موٹر سب سے آگے اور بالکل پھولون سے ڈھکا ہوا تھا۔ اُس پر نوشاہ۔ نوشاہ کے والد اور چچا اور حامدہ کے والد تھے، دوسرے پر نوشاہ کا چھوٹا بھائی۔ دو۔ دوست۔ اور حامدہ کے دونوں بھائی تھے۔ تیسرے پر نوشاہ کے والد کے دو انگریز اور ایک بنگالی دوست۔ چوتھے پر براتیون کے ملازم اور کچھ مختصر سامان بھی۔ جس وقت یہ مجمع پھاٹک میں داخل ہوا تو بینڈ شروع ہوا۔ جو پہلے سے باغ کے ایک حصہ میں موجود تھا۔ ہان دو لٹا کے لباس اور صورت کے متعلق تو میں نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ عمدہ قرمزی رنگ کی ریشمی شروانی۔ سفید پتلون۔ سر پر بہت ہی ٹکے گلہابی رنگ کا بنارس صافا۔ اُس پر چند ہار اور ایک خوشنما پھولون کا گچھا۔ عمر ۲۷-۲۸-۲۹ کے قریب۔ جامہ زیب خوش رو

گورازنگ بنک شک سے درست، یہ حامدہ کے دوٹھاکے
تصویر ہے۔ نوکرون نے پہلے جھک کے سلام کیا۔ پھر گلاب
کیوڑہ اور عمدہ لیونڈر جو گلاب پاشون میں لیے کھڑے تھے براتیوں
پر سلیقے سے چھڑکا۔ اسکے بعد سب لوگ کمرون میں داخل ہو گئے۔
دن کو گیارہ بجے باہر کھانا ہوا۔ اور اسی وقت اندر بھی۔ مگر کیا
ممکن کہ ذرا بھی شور و غل یا کچھ بد نظمی ہو۔ سچ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ بیویوں
کا کیا کہنا۔ کس خوبی سے حامدہ کی والدہ نے بندوبست کیا تھا
کہ تمام مہمان اس حسن انتظام پر عیش عیش کرتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ
ہی خدا نے روپیہ بہت کافی دیا ہے۔ پھر شوہر نیک و لائق۔
بچے مہذب۔ اور نوکر چاکر سلیقے والے۔ کیا کہوں کیسا بارونق۔
گھر ہے خدا نظر بد سے بچائے کھانے کے بعد سب لوگوں نے
دونے بجے تک آرام کیا۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کے دوٹھاکے
باپ نے ایک عمدہ ٹرنگ۔ ایک صندل کا صندوقچہ۔ اور

ایک گنگا جہنی عطر دان گھر میں بھیجا۔ ٹرنک میں عروسی لباس
 تھا صرف ایک جوڑا۔ پیازی رشیم کا مدانی کیا ہوا۔ ایک گوننا
 لباس جو گردن سے لیکر پاؤں تک چھپا سکتا تھا۔ سب جگہ
 ڈھیلا ڈھالا گمر پر کچھ ایسی کاٹ تھی کہ کسا تو نہ تھا مگر ڈھیلا بھی نہ تھا
 ڈھلک تھی اور بہت ہی خوشنما تھی۔ سر پر ایک تیکونا پیازی
 چھوٹا سا دوپٹا۔ جو پیچھے کی طرف کمر تک اور سامنے کی طرف پیٹ
 تک ڈھانک سکے۔ ایک بار ایک ریشمی سُہری نقاب۔ جو تا
 موزے دستانے سب پیازی رنگ کے۔ یہ عروسی لباس تھا
 سنتی ہوں کہ قسطنطنیہ سے ترکی عروسی لباس سے مشابہ بنوا کر
 منگوا یا گیا تھا۔ کامدانی وغیرہ گھر پر بنوالی۔ صندوقچی میں ایک
 جوڑے ہیرے اور موتی کے نفیس اور قیمتی۔ چار نادک
 اور خوبصورت بیروج۔ ایک انگوٹھی ایک جڑاؤ گھڑمی۔ اور
 ایک کنٹھا بہت ہی بیش قیمت ہیرے اور موتی کا تھا عطر دان

مین ہندوستانی اور جاپانی عطر سے بھری ہوئی شیشیاں تھیں۔
 ان چیزوں کو سب نے دیکھا اور تعریف کی۔ اسکے بعد نکاح
 کا تقاضا شروع ہوا۔ اسی مجلس کے بڑے کمرے میں ایک کوچ
 پر حامدہ بیٹھی تھی۔ اور اسکے پاس۔ مین اور حنیفہ سلطان مقابل
 مین کرسیوں پر حامدہ کی بھالوج اور چھپی تھیں۔ برابر والے
 دوسرے کمرے میں مرد تھے۔ اور وہیں سے پوچھ پانچھ ہوئی
 مجھے یہ بات پسند آئی کہ حامدہ سے اقرار کرایا گیا اور معاملہ صاف
 رونے پر نہیں ٹلا اگرچہ ہندوستانی لڑکیوں کا رونا بھی اقرار ہی
 کے برابر مانا گیا ہے۔ اور اس پر فتوے ہو چکے ہیں۔ مگر زبان
 سے اقرار کرنا پورے طور پر حکم رسول کی پابندی ہے۔ اور اسی لیے
 مین اس کو بہتر سمجھی۔ ایک لاکھ مہر بندھا۔ یہ کچھ بہت نہیں ہوا۔
 اس لیے کہ دولہا خود آٹھ نو سو ماہوار کماتا ہے۔ اور گھر کی
 جائیداد بھی پچیس تیس لاکھ کی ہے۔

حامدہ سر جھکائے چُپ چاپ شرابی بیٹھی رہی نکاح
 کے بعد حامدہ کی پُچھی نے کہا کہ اب نتھ پھناتی چاہیے شکل یہ
 کہ حامدہ کی ناک چھدی ہی نہ تھی۔ وہ بڑی گھبرائی اور بہت چپکے
 سے مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیا اب ناک چھیدی جائے گی۔ مگر
 بیگم صاحب نے کہا کہ اگر مجھے نتھ پھناتی ہوتی تو ناک کیوں نہ
 چھدواتی۔ مسلمانوں میں ناک اور اوپر کے کان چھدوانے
 کا رواج نہ تھا ہندوستان میں اگر انھوں نے ہندوؤں سے
 یہ رسم لی۔ عرب اور ترک عورتیں اب بھی اس مصیبت سے آزاد
 ہیں۔ اپنی رسم چھوڑ کے پرانی رسم۔ اور رسم بھی وہ جو تکلیف دہ
 اور بے نتیجہ ہو۔ کیوں جاری رکھیں جب تک نہ سمجھے ان فضول
 رسموں کے پابند رہے۔ مگر سمجھے پر بھی ان کو روارکھنا کیا
 ضرور ہے۔ اور اب تو اکثر جگہ سے اس قسم کی رسمیں اُٹھ گئی
 ہیں۔ غرض بخیر و خوبی نکاح ہو گیا۔ پوئے گیارہ بجے کی ریل سے

رخصتی ٹھہر چکی تھی۔ اس لیے جلدی جلدی ہم لو کون نے
دُھن کو سنوارا۔

کیا بتاؤں اپنی جان۔ کہ اس عروسی لباس اور چند ساد
زیورون میں حامدہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ہار پھول بہت سے
پہنائے گئے تھے۔ عطر خوب لگایا گیا تھا مگر فضول جگر بند اور گہنوں
کپڑوں کے بوجھ سے اس کو ہلکان نہیں کیا گیا۔ آٹھ بجے رات
کو سب نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فراغت ہونے کے بعد
ساڑھے نو بجے سلیم صاحبہ نے حامدہ کو بڑے مکان میں بلوایا
چمن میں جو گول چوترہ بنا ہے۔ اس پر سبز مخملی ٹمگیرے کے نیچے
کوچ اور کرسیاں پڑی تھیں۔ بیچ والے بڑے کوچ پر حامدہ بٹھائی
گئی۔ ارد گرد اور سب بیٹھے۔ حامدہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی
اور ایک بھولی بھالی خوبصورت چینی کی مورت سی معلوم ہوئی
تھی۔ دل تو سب کے بھرے ہوئے تھے مگر اس خیال سے

کہ اگر کوئی رویا تو حامدہ جو بالکل ہی بھری بیٹھی ہے بیدار ہوئے گی۔
 سب نے ضبط کیا دس بجے کے قریب حامدہ کے والد اور دونوں
 بھائی گھر میں آئے۔

اب ایک میز پر وہ چیزیں جو مان باپ اور دوسرے
 عزیزوں اور دوستوں نے دی تھیں اکٹھی کی گئیں۔ اس کے بعد
 باپ اور بھائی نے حامدہ کا سر باری باری سینہ سے لگایا جب
 یہ لوگ باہر جانے لگے تو بیچاری حامدہ ضبط نہ کر سکی۔ مان نے بیٹی
 کو کلیجے سے لگایا اور اپنے دل پر پتھر رکھ کے یوں سمجھا نا شروع کیا۔ کہ
 ”بیوی رونے کی کیا بات ہے چوتھے روز تو پھر آجاؤ گی خدا
 نہ کرے ہمیشہ کی جدائی تھوڑا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ضبط
 اور استقلال شریف بیٹیوں کو لازم ہے۔ تم سمجھ دار ہو۔ یہ ٹھڈا پان
 کیسا۔ بیٹی ابھی تو چار دن کو جا رہی ہو۔ ایسا بھی اتفاق ہو گا کہ
 دو دو برس نہ آسکو گی۔ تو کیا یوں رو رو کے جل تھل بھرا کر و گی۔

اور سسرال والوں سے یہ کہلواؤ گی کہ بہو کا اس گھر میں جی نہیں لگتا۔ میری پیاری۔ کون بیٹی مان باپ کے پاس عمر بھر رہی ہے۔ ہم بھی اپنے مان باپ کے ایسے ہی پیار سے تھے اور پھر آخر اسی طرح اپنے سیکے سے الگ اور عزیزوں سے جدا ہوئے جس طرح آج تم جدا ہو رہی ہو۔ مان باپ کے گھر تو لڑکی مہمان ہوتی ہے۔ شوہر ہی کا گھر اُس کا اپنا گھر ہوتا ہے اصلی زندگی اُس کی اسی وقت شروع ہوتی ہے جب وہ بیاہ کے بعد اپنے گھر جاتی ہے۔ تب ہی ہنرمندیوں کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ اب وہ وقت آیا ہے کہ تم اپنی عقل اور تعلیم کو کام میں لاؤ جن لوگوں سے خدا نے تمہاری تقدیر وابستہ کی ہے۔ ان کو حُسن اخلاق اور خدمت گزاری کے ذریعہ سے اپنا بناؤ۔ اور جس گھر میں جا رہی ہو اُس کو اپنے انتظام کی خوبی سے چارچاند لگاؤ ساس سسر کو مان باپ کے اور جھٹھ دیوڑ۔ مندوں کو۔

بھائی بہن کے برابر سمجھنا۔ جٹھانیوں دیو رانیوں سے بھاؤ ہون
 کا سا برتاؤ رکھنا۔ غرض اُس گھر کو اپنا گھر اور گھر والوں کو اپنا
 عزیز جاننا۔

اپنے میان کی خوشی اور آسائش کو اپنی خوشی اور
 آسائش پر مقدم سمجھنا۔ ہمیشہ نرمی اور خوش مزاجی کے ساتھ
 اُس سے بات کرنا۔ ہمت اور استقلال سے کام لینا۔ نرم گرم
 باتیں تحمل۔ بردباری اور عقل کے ساتھ برداشت کرنا۔ حامدہ
 پیاری۔ مین نے جس محبت اور ناز برداری سے تم کو انیس
 برس پالا۔ اور تمھاری تعلیم و تربیت کی ہے۔ اس کا صلہ اب
 مین تم سے چاہتی ہوں۔ اور وہ صرف یہ ہے کہ جب تک تم کو
 خدا زندہ رکھے اپنے کسی فعل سے میرے اور اپنے ابا جان
 کے نام پر حرف نہ آنے دینا۔ اچھا بیٹی اب دل کو سنبھالو دیکھو
 تمھارے سب عزیز اور تمھاری پیاری سہیلیاں تم سے ملنے کو

کھڑی ہیں ان سے ملو۔ اور ان سب کی اور میری ہزاروں عین
لے کر خوش خوش اپنے گھر سدھارو۔ حامدہ تم پریشان اور
روتی ہوئی جاؤ گی تو بتاؤ کہ میرے دل کو کس طرح چین آئے گا،
ادھر حامدہ جیسی پیاری لڑکی کی جدائی کا خیال۔ ادھر
یہ موثر تقریر کون ایسا تھا جسکے آنسو روکے سے ٹک جاتے۔
سب کی آنکھوں سے زوال لگے ہوئے اور ہچکیان بندھی
ہوئی تھیں۔ مگر آفرین ہے سگم صاحبہ کے ضبط کو کہ جب تک
لڑکی سوار نہ ہو گئی اُن کی آنکھ سے قطرہ نہ گرا۔ تمام جسم سے تھر تھر
کانپ رہی تھیں چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔
اور آنکھیں گویا دلبالب پیالے تھے۔ جن کو آنکھوں نے
پھلکنے نہ دیا جب حامدہ ہم لوگوں سے مل کے رخصت ہو گئی تو نواب صاحب
(حامدہ کے والد) دو لٹا کو گھر میں لائے۔ دو لٹا نے سلام کیا
ساس نے ۲۵۔ اشرفیان اور ایک قیمتی میرے کی انگوٹھی دی

سُسر نے ایک فنّ مع عمدہ جوڑی کے دی۔ اور برات بخیر فوہی
 رخصت ہوئی۔ ہاں یہ تو مین نے بتایا ہی نہیں کہ حایدہ کو میکے
 سے ملا کیا۔ بیس ہزار نقد تو گھر سے دیے گئے۔ کیونکہ بگیم صاحبہ
 نے بہت سے زیورات۔ کپڑے۔ اور فضول برتن۔ بھانڈے
 دینا پسند نہ کیا۔ ایک ہزار روپیہ چھپانے اور ایک ہزار
 مامون نے دیا۔

پُھپی۔ نے کلائی کی جڑاؤ گھڑی دی۔ ایک ہلال کا
 بروج اور قیمتی زمرود کی انگوٹھی، حنیفہ سلطان نے۔ اور گھڑی کی
 جڑاؤ زنجیر تاجدار دُلہن نے دی۔ بھائیوں کی طرف سے
 سلائی کی مشین۔ اور ایک الماری نو بصورت مجلد کتابوں سے
 بھری ہوئی اور ایک آبنوسی ڈسک جس پر چاندی کا عمدہ کام
 کیا تھا۔ لکھنے کے سامان سے سجا ہوا دیا گیا۔ مین نے ہار مونیم
 دیا۔ بھابھی جان نے ایک ڈرینگ کیس۔ اور شہیر مین نے

ہاتھی دانت کا عطر دان۔ شمس النساء اور اختر النساء نے اپنے
 بنائے ہوئے چند کُشن۔ میز کی کارچوبی چادرین۔ ریشمی کام
 کے دو پردے اور اپنے اسکول کی تصویریں بطور یادگار
 کے دین نقد کے علاوہ گھر سے ایک عمدہ قلمی قرآن شریف
 ایک چاندی کی رحل۔ محلی کارچوبی جانااز۔ ایک چاندی کا
 چارکاسٹ۔ سنگا رمیز مع جملہ سامان کے بارہ آدمیوں کے
 کھانے کا سامان عمدہ چینی۔ شیشے اور چاندی کے۔ دو بڑے اور
 دو اوسط گیس کے لیمپ۔ ایک کپڑوں کی الماری نہایت
 نفیس و نازک جس پر آبنوس اور ہاتھی دانت کا عمدہ کام کیا ہوا تھا
 اور اس میں چار جوڑے کپڑے یعنی چار نفیس اور قیمتی بناری
 ساڑیاں مع تمام لوازمات کے تھیں۔ ایک نہایت خوبصورت
 ولایتی سہری بیش قیمت پردوں سے سجی ہوئی۔ ایک چھوٹی سی
 خوبصورت اور قیمتی پردے دار موٹر کار دوسیٹ کی۔ زیورون میں

دو بروج۔ ایک جوڑ بندے۔ چار چوڑیاں ہاتھوں کی۔ ایک گلوبند۔ ایک موتیوں کی خوب لمبی لڑی۔ چار انگلیٹھیاں۔ یہ پورا سیٹ موتی اور ہیرے کا نہایت نفیس اور نازک اور تخمیناً ایک لاکھ تک قیمت کا تھا۔ یہ سب میں نے جہیز کی فہرست سے نقل کر لیا تھا۔ جو آپ کو لکھتی ہوں۔ رات بھر ہم وہیں رہے صبح کو اپنے گھر آئے۔ چوتھے روز حامدہ واپس آئی۔ اور پانچویں روز عام دعوت کا بلاوا دیا گیا جس میں عزیز۔ غیر۔ ملاقاتی۔ سب ہی تھے۔ رات کا کھانا تھا میں تو بس اُن کے گھر کے قاعدون اور بگم صاحب کے سلیقے کی قائل ہوں۔ اتنی بڑی تو دعوت کہ تقریباً چوتھائی شہر اُمنڈ آیا تھا۔ گرواہ رے انتظام کیا مجال کہ کسی چیز کی کمی ہوئی ہو یا ترتیب میں فرق آیا ہو۔ یا شور و غل ہوا ہو یا کسی کو خیف سی بھی شکایت ہوئی ہو۔ نوکر چاکر معلوم ہوتا تھا کہ طلسمی پتلے ہیں جو اشار پر اپنا کام بجالاتے ہیں۔ پھر یہ دیکھیے کہ بڑوں کی میزِ علٰیہ۔

کمنون کی علیحدہ۔ بچوں کی علیحدہ۔ ہندو بہنوں کی علیحدہ۔

عیسائی اور یورپین بہنوں کی علیحدہ۔ اور قریب قریب یہی
انتظام باہر بھی تھا۔ گھاس کے چھوٹے چھوٹے قطعون پر

صاف ستھری میزیں۔ جن پر سب چیزیں چنی ہوئی۔ برقی

روشنی جو رات کو دن بنا رہی تھی شفاف کپڑے پہنے ہوئے

سلیقہ مند ملازم حاضر۔ بیچ کی لائن میں فوارے چل رہے تھے

جن پر رنگین لالٹینوں کا عکس پڑ پڑ کر پانی کو کبھی سُرخ کبھی زرد

کبھی آسمانی بنا دیتا تھا۔ چھوٹی مجلس کے صحن میں کچھ اور رہی

لطف تھا۔ جن بیویوں کو میز کرسی پر کھانے میں تکلف تھا۔

یا جنہوں نے اتنے بڑے مجمع میں شریک ہونا پسند نہیں کیا۔

اُن کے لیے وہاں تختوں پر اُجلی چاندنیاں۔ اور رنگین باغ بہار

قالین پیچھے۔ سفید دسترخوان لگے اور نفیس کھانے چُخبے ہوئے

تھے۔ سبز اور سفید کنول روشن تھے۔ غرض عجب بہار تھی۔

کمان تک لکھون۔ ساڑھے گیارہ بجے کھانا ختم ہوا۔ مس جارج
 اور مس جکیسن نے پیانو بجایا۔ شمس النساء اور اختر النساء نے
 ہارمونیم اور ستار سُنایا۔ شمس النساء اور اختر النساء آپ کو یاد ہونگی۔
 اے یہ وہی دونوں لڑکیاں ہیں جو رشتے میں نواب باندہ کی عزیز
 ہوتی ہیں۔ ان کے سوتیلے چچا نے ان کو اسکول میں تعلیم دلوائی ہے۔
 یہ کئی مرتبہ اپنی چچی کے ساتھ حامدہ کے یہاں آئیں اور آپ سے بھی
 ملین تھیں۔ حامدہ تو ایک ہر دل عزیز لڑکی ہے ان لڑکیوں کو
 اس سے ایسی محبت ہو گئی کہ اُس کی شادی میں شریک ہو
 ہوئے کو اپنے وطن الہ آباد سے یہاں آئیں۔ خیر یہ تو بیچ میں
 دوسری بات آپڑی ہاں تو مہمانوں کو پانِ عطر۔ الاچی۔ ہار وغیرہ
 تقسیم ہوئے اور سوا بارہ بجے تعریف کرتے ہنسی خوشی لوگ
 رخصت ہوئے۔ ہم لوگ رات کو رہ گئے صبح کو مجھ سے اور حامدہ
 سے خوب باتیں ہوئیں جو چیزیں اس کو سسرال سے ملی تھیں وہ

سب دیکھیں۔ حامدہ کے دولہا نے اپنی اور حامدہ کی تصویر
 شادی کے لباس میں اپنے بھائی سے کچھوائی تھی۔ وہ بھی
 دیکھی۔ اور سہ پہر کو ہم اپنے گھر آئے۔ اپنی جان۔ یہ سب خوبان
 تعلیم اور اس سے زیادہ تربیت کی ہیں۔ بیشک دولتمندی
 نے اور بھی جلا دیدی ہے لیکن اگر کروڑوں روپیہ ہوا اور
 تعلیم و سلیقہ نہ تو ب خاک ہے۔ آخر عزیز بانو کی شادی
 گزشتہ سال آپ دیکھ ہی چکی ہیں روڈ کی تو ان کے یہاں بھی
 ریل پیل ہے۔ اور اسی عزیز بانو کی شادی میں کوئی
 دو ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ ہو گیا ہو گا مگر کیا حالت تھی؟ مہمان
 پریشان۔ عزیز نضا۔ عین نکاح کے وقت مہر پر وہ جھگڑا کہ الامان
 یہ اسی لیے تو تھا نا کہ گھر بھر جاہل گنوار کا لٹھ ہے۔ پیاری کنیز فاطمہ کو
 میری طرف سے پیا کر لیجیے۔ اور دولہا بھائی کو تسلیم کیے۔
 آپ کی عنایت فاطمہ

باہتمام اسحاق علی علوی

الناظر پرس واقع چوک لکھنؤ میں چھپی